Individualland

Creating space for the individual

فرد

شمارہ نمبر ۵، مئی ۲۰۱۳

الیکشن ۲۰۱۳

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT

کے تعاون سے

فرد

شمارہ نمبر۵ مئی ۲۰۱۳ء

ایڈیٹر:
حمزہ خان

کوارڈینیشن: اویس محمود
سندس سیدہ، سید فہد الحسن

کارٹونسٹ:
فاروق قیصر

ٹائٹل کور ڈیزائین
عدیل امجد

پبلشر:
انڈیویجوئل لینڈ پاکستان

آئی ایس بی این ۹۷۸-۹۶۹-۹۵۸۲-۱۹-۶

فہرست

ایڈیٹر کی میز سے _____ ۱
جمہوریت کیوں ضروری ہے؟ _____ ۲
فاٹا کی آنکھ سے _____ ۷
الیکشن 2013ء سیاسی جماعتوں کی مارکیٹنگ کمپئین _____ ۱۱
بلوچستان میں پرامن انتخابات کا انعقاد؟ _____ ۱۷
لبرل نقطہ نظر _____ ۲۲
ایک سیاسی کارکن سے گفتگو _____ ۲۴
عوام اور الیکشن کمیشن آف پاکستان _____ ۲۷
ان میں سے کوئی نہیں _____ ۲۹
عسکریت پسندی اور جمہوریت _____ ۳۱
جو عوام چاہے گی _____ ۳۴
ایوان اقتدار اور سیاست: ایک تبصرہ _____ ۳۷
سب سے بڑا روپیہ _____ ۴۰

Individualland
Creating space for the individual
نمبر۱۲۔بی، سٹریٹ نمبر۲۶، سیکٹر ایف ۱/۸، اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

ایڈیٹر کی میز سے

پیارے قارئین!

جب یہ اشاعت آپ تک پہنچے گی اس وقت انتخابات کی تاریخ ہمارے سامنے ہوگی۔ انتخابات کا جوش اپنے عروج پر ہوگا۔ سیاسی جانثار اپنے حلقوں میں ریلیاں منعقد کرتے دکھائی دیں گے۔ پرنٹ کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا گروپس بھی انتخابات کے حوالے سے ہر خبر کا احاطہ کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹے کام کر رہے ہوں گے۔ سڑکیں، پارک، مارکیٹیں اور دیگر عوامی مقامات رنگ برنگے جھنڈوں اور بینرز سے سج جائیں گے۔ سیاسی کارکنوں کو ان کی پارٹی کے منشور کے نعرے لگاتے دکھایا جائے گا۔ پاکستان میں ایک سیاسی طوفان ہوگا اور ۱۱ مئی ۲۰۱۳ء کو خاموشی چھا جائے گی۔ سیاسی کارکن خاموش ہو جائیں گے، بینرز اور پرچم ہوا میں لہراتے چھوڑ دیے جائیں گے اور سیاستدان انتخابات کے نتائج سننے کے لیے ٹیلی ویژن سے چپک کر بیٹھ جائیں گے۔ کون جیتے گا اور کون ہارے گا؟ کوئی بھی اس بات سے آگاہ نہیں۔ جیسے جیسے نتائج سامنے آنا شروع ہونگے، انتخابات کے لیے کیے گئے تمام اقدامات بھلا دیے جائیں گے اور اسی گرما گرمی میں اس مہینے کا فرد بھی کہیں پسِ پشت چلا جائے گا۔

یقیناً یہ انتخابات بہت سے اہم خیالات اور تجزیوں کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے۔ قبل از انتخابات کی گئی گفتگو حقیقت میں شہریوں کے تصورات کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ نئے انتخابات کے نتائج کچھ بھی ہوں، ملک میں ایک اہم واقعہ دیکھنے کے بعد عام شہری کی آراء تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس شمارے کے تمام مضامین کو قلم بند کرنا آسان نہیں تھا۔ مرکزی خیال تو انتخابات کا احاطہ کرنا تھا، مگر ہر جگہ نظر دوڑانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس پر بہت کام ہو چکا ہے اور پیچھے کچھ بھی نہیں بچا۔ اسی دوران ٹیم کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ معمول سے ہٹ کر کچھ سوچیں۔ ایک ایسے نقطہ نظر کی ضرورت تھی، جو انتخابات کو ایک نئے انداز سے دیکھے۔ ایک خیال پرانی روایات کو مدِ نظر رکھ کر مضامین لکھنے کا تھا، دوسرا تیز رفتار ٹیکنالوجی کے دور میں (سوشل میڈیا ٹولز، معلومات کی منتقلی، انتہا پسند اور ترقی پسند سوچ کے درمیان سخت جدوجہد) اور پاکستان جیسے ملک میں ان کا نفاذ کو سامنے رکھ کر کام کی شروعات کرنا تھا۔ مضامین جیسے 'عسکریت پسندی اور جمہوریت' نئے انتخابات میں سوشل میڈیا کا استعمال'، 'جمہوریت پاکستان کے لیے کیوں ضروری ہے؟' اور دیگر مضامین انتخابات کو مدِ نظر رکھ کے لکھے گئے ہیں۔ بعض تجربہ کار سیاستدانوں، سول سوسائٹی کے اراکین اور صحافیوں نے بھی اس شمارے کے مختلف مضامین لکھنے میں ہماری مدد کی ہے۔ ہم ان دوستوں کے بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہمارے لیے وقت نکالا اور ہمارے لیے لکھا۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین ان کے مضامین کو سراہیں گے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی قیمتی آراء سے آگاہ کرتے رہیں گے۔

اگلے شمارے تک کے لیے اجازت!

حمزہ خان

جمہوریت کیوں ضروری ہے ؟

جنید قیصر

برٹش کونسل کے ایک حالیہ سروے کے مطابق ملک میں رہنے والے بیشتر نوجوانوں کے خیال میں جمہوریت پاکستان کے لیے درست نظامِ حکومت نہیں۔اس جائزے کے دوران اٹھارہ سے انتیس سال کی عمر کے پانچ ہزار نوجوانوں سے معلومات حاصل کی گئیں۔جس میں ۹۴ فیصد نوجوانوں کا کہنا تھا کہ ملک صحیح سمت میں نہیں جا رہا۔۲۰۰۷ میں کیے گئے سروے میں یہ شرح ۵۰ فیصد تھی ۔بہترین سیاسی نظام کے بارے میں پوچھے جانے پر سب سے زیادہ افراد نے شرعی نظام کے حق میں ووٹ دیا جبکہ فوجی نظام دوسرے اور جمہوریت تیسرے درجے پر رہی۔سروے میں شامل ۷۰ فیصد نوجوانوں کو پاکستان کی فوج پر زیادہ اعتماد تھا اور جمہوری حکومت کے حق میں بولنے والوں کی تعداد صرف ۱۳ فیصد رہی۔مئی میں ہونے والے عام انتخابات میں ملک کی ۳۰ برس سے کم عمر کی آبادی کا کردار اہم مانا جا رہا ہے جو کہ رجسٹرڈ ووٹروں کا تقریباً ایک تہائی ہے۔لیکن سروے میں شامل نوجوانوں میں سے ۵۰ فیصد سے بھی کم نے کہا کہ وہ لازمی طور پر ووٹ ڈالنے جائیں گے۔یہ جائزہ پاکستان میں غالب رائے عامہ، انداز فکر اور قنوطی نسل کی عکاسی کرتا ہے۔اس جمہوریت مخالف سوچ کی تشکیل میں رائے عامہ کو سمت دینے والے اداروں کا بنیادی کردار ہے۔ان اداروں میں میڈیا، اخبارات میں چھپنے والے کالم اور مضامین ،ماتم کرتے ٹاک شوز ،خیالی دنیا کی چاشنی سے لبریز لٹریچر ،نفرت سے بھری نصابی کتب اور خطبہ دینے والے مولوی یا پادری حضرات نمایاں ہیں ۔طویل فوجی آمرانہ ادوار نے ان اداروں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے اور اب ان اداروں کے مفادات بھی غیر جمہوری قوتوں سے وابستہ ہو گئے ہیں۔لہٰذا یہ ایک ایسی فکر کو پروان چڑھا رہے ہیں ،جو جمہوریت مخالف اور رجعت پسند ہے۔ یہ نوجوان نسل الجھن کا شکار اس لئے ہے کہ یہ شرعی نظام کے حق میں ہیں ۔مگر ووٹ مذہبی جماعتوں کے برعکس لبرل سیاسی جماعتوں کو دیتے ہیں اور شائد یہ برگر کھانے اور بالی ووڈ دیکھنے والے ایک دن بھی طالبان کے شرعی نظام کے تحت نہ گزار سکیں۔ان کا شرعی نظام کا مطالبہ بھی ایک فیشن ہے۔

اگر تاریخی حقائق کو مدنظر رکھ کر پاکستان میں جمہوریت کے حوالے سے ریاستی ذہنیت کا تجزیہ کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ریاست کی جانب سے ایک مخصوص رجعت پسند، مذہبی ،نظریاتی فکر کو سپورٹ کیا گیا ہے اور آزاد فکر اور تنقیدی شعور پر کئی بندشیں رہیں ہیں۔یہی وجہ بنی کہ پاکستان کا نوجوان طبقہ یوٹوپیاء (آدرشلوک) کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خارجہ اور معاشی پالیسی ہمیشہ سے فوج کے اختیار میں رہی ہے حتٰی کہ جمہوری ادوار میں بھی بنیادی اور اہم فیصلے فوج کی مرضی یا مشاورت کے بغیر نہیں کیے گئے ۔جب اس صورت میں غیر نمائندہ قوتیں پاکستان پر بلاشرکت حکمرانی کے مزے لیتی رہی ہوں،تو غیر منطقی انداز فکر پاکستان میں جمہوریت اور غیر جمہوری ہوسکتا ہے،جس کا اظہار برٹش کونسل کے سروے میں ہوا ہے اور یہ سفر کو بہت کٹھن اور انتہائی پرخطر چیلنجز سے بھر پور بنا رہا ہے ۔۱۸ فروری ۲۰۰۸ کے انتخابات کے نتیجے میں

پاکستان میں ڈیموکریٹک ٹرانزیشن یا جمہوری تبدیلی کا عمل شروع ہوا تھا اور تمام تر رکاوٹوں کے باوجود ارتقائی منازل طے کر رہا ہے ۔صدر مملکت آصف علی

زرداری نے بڑے پرعزم اور حوصلہ انگیز انداز میں کہا تھا کہ اب آمریت قصہ پارینہ بن چکی ہے۔

ملک کی ۶۵ سالہ تاریخ میں پہلی بار ایک جمہوری حکومت اپنی مدت پوری کر کے عنان اقتدار دوسرے جمہوری حکومت کے حوالے کرنے جارہی ہے۔ چوں کہ انتقال اقتدار کا یہ مرحلہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار دیکھنے کو ملے گا، اقتدار کی یہ منتقلی اس سے پہلے پاکستان کی تاریخ میں جمہوری اور آئینی طریقے سے نہیں آئی ہے، بلکہ یہاں پر اقتدار پر قبضہ کی تاریخ ہے۔ پاکستان میں جمہوریت پسند طبقات اسے ایک جمہوری روشن پاکستان کی پیش رفت قرار دے رہے ہیں۔ یہ بھی ایک خوش آئند حقیقت ہے کہ عوام کی نمائندہ سیاسی جماعتیں بہت تلخ تجربات سے گزر کر ہر صورت میں جمہوریت کا دفاع کرنے کے لیے پرعزم دکھائی دیتی ہیں۔ ایک ایسے ملک جہاں دہائیاں فوجی حکومتوں کے زیر سایہ گزری ہوں، جہاں آزاد فکر پر قدغنیں ہوں وہاں پر کسی جمہوری حکومت کا آئینی اور پرامن انتقال اقتدار خوش آئند ہے۔

جمہوری حکومت کو ۲۰۰۸ میں اقتدار منتقل ہوا تو اس وقت پاکستان بے یقینی کا شکار تھا۔ ملک کی مغربی سرحدوں پر فوج دہشت گردی کیخلاف جنگ لڑ رہی تھی اور مشرقی سرحد پر بھی جنگ کے خدشات تھے۔ ۱۹۷۳ کا آئین اپنی مسخ شدہ شکل میں موجود تھا، میڈیا اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا، اعلیٰ عدلیہ کے جج پابند سالاسل تھے، بے نظیر بھٹو دہشت گردی کا شکار ہو چکی تھیں، نواب اکبر بگٹی کے قتل کے بعد بلوچستان کے عوام میں پایا جانے والا احساس محرومی عروج پر تھا، ملک بجلی اور گیس کے طویل لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا اور زرعی ملک ہونے کے باوجود پاکستان میں آٹے اور چینی کے لیے طویل قطاریں دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ دہشت گردی، خودکش دھماکوں کے خوف اور ملک میں موجود لاقانونیت نے شہریوں کو ذہنی اذیت سے دوچار کر رکھا تھا اور ملک کے شمال مغرب میں اکثر علاقے، شدت پسندوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔

فروری ۲۰۰۸ سے مارچ ۲۰۱۳ تک جو جمہوری دور یا ٹرانزیشنل فیز ہے اس میں منتخب ایوانوں اور جمہوری حکومت کو بے تحاشہ سازشوں کا سامنا رہا، جہاں ہر لمحہ ایک بے یقینی کی کیفیت چھائی رہی مگر با وجود اس کے نمائندہ جمہوری اداروں نے تاریخ ساز کام سرانجام دیے۔ اسی پارلیمنٹ نے ۱۹۵۳ کے آئین کو اس کی اصل صورت میں بحال کیا جو کہ روح کے حوالہ سے جمہوری، وفاقی اور پارلیمانی آئین ہے جس میں مالیاتی اختیارات کے انتقال، وسائل کی ملکیت، پالیسی سازی میں شراکت اور اجتماعی فیصلہ سازی کے اصولوں پر مبنی وفاقی خصوصیات کو اہمیت حاصل ہے۔ آٹھویں ترمیم، لیگل فریم ورک آرڈر اور سترویں ترمیم ختم کر کے فوجی آمروں کے وحدانی ریاست کے ڈھانچے کو پھر سے وفاقی ڈھانچے میں تبدیل کیا گیا۔ پاکستان میں وفاقی، پارلیمانی، جمہوری نظام کی بحالی سے ناراض گروہوں کو ایک بار پھر سے مرکزی سیاسی دھارے میں لانا ممکن ہو سکے گا اور اس کے ذریعے مسلح جدوجہد کی تحریکیں دم توڑ سکتی ہیں جس سے معاشرے میں عمومی اور افقی سطح پر خلیج کم ہو سکے گی اور جمہوری کنٹرول کرنا ممکن ہو سکے گا۔

سوات آپریشن کے دوران مالاکنڈ ڈویژن میں پچیس لاکھ افراد بے گھر ہوئے، ان علاقوں کو دہشت گردوں سے پاک کر کے ۹۰ دنوں میں لوگوں کو انکے گھروں میں دوبارہ آباد کیا گیا، جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔

جمہوریت ہی پاکستان کو داخلی اور خارجی سطح پر مضبوط اور قابل احترام ملک میں تبدیل کر سکتی تھی۔ پاکستان کی بقاء اب اس امر میں پوشیدہ ہے کہ جمہوریت کو مکمل طور پر پنپنے کا موقع دیا جائے اور آئین میں تمام متنازعہ شقوں، باشمول آرٹیکل ۶۲ ۶۳ جو جمہوریت اور سیاست مخالف ہیں، ان کو ختم کیا جائے۔

یہ بھی پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ صدر مملکت نے اپنے اختیارات پارلیمان کے حوالے کر کے خود کو مکمل طور پر بے اختیار کر لیا ہے۔ کنکرنٹ لسٹ کا خاتمہ کر کے صوبائی خودمختاری میں اضافہ کیا گیا ہے۔ سنیٹ میں مذہبی اقلیتوں کو پہلی مرتبہ نمائندگی دی گئی ہے۔ ججوں اور الیکشن کمیشن کے اراکین کی تقرری کا ایک شفاف طریقہ کار واضح کیا گیا ہے۔ آرٹیکل ۱۰ اے کے تحت منصفانہ سماعت کا حق دیا گیا ہے۔ آرٹیکل ۱۹ اے کے تحت معلومات تک رسائی کا حق اور آرٹیکل ۲۵ اے کے تحت معلومات تک رسائی کا حق ریاست کی ذمہ داری قرار پائی کہ وہ

پانچ سال سے ۱۲ سال تک کی عمر کے بچوں کو مفت بنیادی تعلیم مہیا کرے۔ گڈ گورننس کے لیے اٹھارویں ترمیم نے آئندہ انتخابات کے نتیجے میں بننے والی کابینہ میں کل ارکان کی ۱۱ فیصد تک حد مقرر کی ہے۔ الیکشن کمیشن اور ججوں کی تقرری کے حوالے سے تمام پارلیمانی کمیٹی حزب اقتدار اور اختلاف کے ارکان کو مساوی نمائندگی مہیا کرتی ہے۔ ۱۷ وزارتیں صوبوں کو منتقل کر کے انتقال اقتدار کے اصولوں کو وسعت دی گئی ہے۔

اب یہ فلسفہ تبدیل ہو چکا ہے کہ مضبوط مرکز ایک مضبوط پاکستان کی ضمانت ہے۔ اب اس کی جگہ ریاست اس فلسفہ پر عمل پیرا ہے کہ مضبوط صوبے ہی مضبوط پاکستان کی ضمانت ہیں۔ اٹھارویں ترمیم کے ذریعے ایک بار پھر حقیقی وفاقی، جمہوری اور پارلیمانی اصولوں کو زندگی دی گئی۔

اس جمہوری دور میں ۵ واں این ایف سی ایوارڈ منظور ہوا۔ اور اب ہمارے پاس نسبتاً بہتر وفاقی اور وفاقی اکائیوں کے درمیان وسائل کی تقسیم کا فارمولا موجود ہے۔ اس میں گلگت بلتستان کو آئینی طور پر اختیار دیا گیا، صوبوں کو مالیاتی اور انتظامی حوالے سے بااختیار کیا گیا، آغاز حقوق بلوچستان پیکج کا علان کیا گیا۔ اس دور میں سیاسی مخالفین کے خلاف مقدمات قائم نہیں کیے گئے اور کوئی بھی سیاسی قیدی نہیں رہا۔ پارلیمنٹ میں ریکارڈ قانون سازی ہوئی اور عوام سیاسی عمل میں کسی نہ کسی طرح شامل رہے۔

اگرچہ تاحال قومی سلامتی اور خارجہ پالیسی کے معاملات بدستور فوج کے غالب کنٹرول میں ہیں۔ تاہم گزشتہ پانچ سالوں کے دوران سول ملٹری تعلقات کو ازسرنو ترتیب کرنے کی کوشش بھی ہوئی ہے اور بہت سے معاملات میں سیاسی قوتوں کو کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے جیسا کیری لوگر بل اور میموگیٹ کے معاملے میں سیاسی عمل کا تسلسل جمہوری اداروں کی بالادستی کی راہ ہموار کرے گا۔

اس بات کے قومی امکانات ہیں کہ آئندہ پارلیمنٹ قومی سلامتی، خارجہ پالیسی اور بجٹ کے معاملات اپنی دسترس میں لانے کے حوالے سے قدم اٹھانے کے لیے مشترکہ مفادات کے نکتے تلاش کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے گی۔

اس وقت پاکستان میں جمہوریت کا پودا نشوونما پا رہا ہے اور اب یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ جمہوریت مخالف طاقتور قوتوں کی تمام تر سازشوں کے برخلاف ایک تناور درخت میں تبدیل ہونے کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ اس پودے کو ایک بار پھر سے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے جمہوریت مخالف عناصر مصروف عمل ہیں۔ ان تمام کامیابیوں کے باوجود اگر کوئی یہ سوال اٹھاتا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت نے کیا دیا؟ تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت نے عوام کو یہ حق لوٹا دیا کہ وہ اپنے نمائندوں کو مسترد کر دیں یا پھر ازسرنو منتخب کر لیں۔

ایک جمہوری معاشرے میں ووٹ ہی شہریوں کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پاکستان کو درپیش چیلنجز جن میں نظریاتی یا جمہوری ریاست کی بحث، غیر نمائندہ اداروں کی بالادستی، کمزور جمہوری ڈھانچہ، انتہا پسندی، امن کی خراب صورت حال، وسائل کی کمی اور بے روزگاری جیسے مسائل کا حل صرف جمہوریت میں مضمر ہے۔ پاکستان کی موجودہ صورت حال میں عام شہری اور اس کا ووٹ ہی ایک ایسی واحد قوت ہے جو پاکستان کے حالات کو بدل سکتا ہے۔

وجود میں آنا ایک سیاسی جمہوری عمل تھا، باوجود اس کے یہاں آمرانہ ادوار میں سیاستدانوں نے پاکستان کے معرض جمہوری عمل سے نفرت کی تعلیم دی، مگر عوام نے اپنا رشتہ جمہوری اداروں اور عمل سے ٹوٹنے نہیں دیا۔ انھوں نے ووٹ کی پر امن مگر انتہائی موثر طاقت سے جمہوری ارتقاء میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان کے عوام کی اسی جمہوریت کے لیے قربانیاں اور چاہت ہے، جس نے انہیں یہ اختیار پھر لوٹا دیا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں اور حکومت کا انتخاب کر سکیں۔ اس حقیقت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جا چکا ہے، کہ جدید، روشن خیال اور ترقی پسند ریاستوں کی تشکیل جمہوریت کے بغیر ممکن نہیں، بلکہ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت ہی جدید ریاستوں کو بنیاد فراہم کرتا ہے جمہوریت جس کو سادہ زبان میں عوامی حکومت کہا جاتا ہے سائنسی اصولوں، عقلی بنیادوں اور اخلاقی اصولوں پر مبنی ایسا سیاسی نظام ہے جس میں عوام کسی نہ کسی طرح فیصلہ سازی کے عمل میں شامل ہوتے ہیں جس میں عوام کے مفادات مقدم ہوتے ہیں، جس میں مسائل کے حل کے لیے مذاکرات، مکالمے اور رواداری کے کلچر کو فروغ دیا

جاتا ہے۔جمہوریت میں یہ تصور کیا گیا ہے کہ کسی نظریہ،خیال، جماعت ،فرقہ اور مذہب کی بنیاد پر کسی سے تعصب نہیں برتا جائے گا اور تمام انسانوں کو بنیادی، مساوی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔ایک جمہوری معاشرے کے لیے سماجی انصاف اور ہم آہنگی لازم ہے،ایک کثیر الجہت ،اعتدال پسند معاشرہ اس وقت تک معرض وجود میں نہیں آسکتا جب تک اس میں انسانی حقوق کو مکمل احترام نہ ہو۔ایک جمہوری معاشرے میں ہی بنیادی انسانی حقوق کی حیثیت اور عظمت کو پہچان ملتی ہے۔ایک امن پسند اعتدال اور انصاف پر مبنی جدید خوشحال معاشرے کے لیے جمہوریت کا ہونا بہت ضروری ہے،جمہوریت اپنے فلسفے اور عمل سے نا انصافی،عدم رواداری جنگ اور استحصال سے نجات دلاتی ہے۔جمہوریت چونکہ بنیادی انسانی حقوق کی ضامن ہے۔لہٰذا اس کے ذریعے شہریوں کو ان معاشی، سیاسی،ثقافتی اور مذہبی حقوق ملتے ہیں۔

پاکستان میں آج بھی مذہبی انتہا پسندی، جاگیردرانہ ذہنیت،قدامت پسندی کے ساتھ ساتھ غیر نمائندہ قوتیں بہت زیادہ مضبوط ہیں،جس کی وجہ سے ہمارے سیاسی اداروں کے درمیان عدم توازن کی کیفیت ہے۔ایسی صورت میں آمروں کے لیے بہت آسان ہے کہ وہ عوام کو گمراہ کر کے ان کے حقوق سلب کر سکیں۔یہ وجہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں غیر نمائندہ قوتیں اپنی ترجیحات اور مفادات کے لیے عوامی فلاح اور انسانی حقوق کے آفاقی تصورات کو پس پشت ڈالتی رہی ہیں۔غیر جمہوری ادوار اور فوجی صدارتی نظاموں کی وجہ سے یہاں نمائندہ جمہوری سیاسی کلچر فروغ نہیں پا سکا۔مزید براں سیاسی جماعتوں کو کمزور کرنے اور جمہوری عمل کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے مذہبی جماعتوں کو مضبوط کیا جاتا رہا ہے چونکہ ہمارے ہاں مضبوط غیر نمائندہ اداروں کو ابتداء ہی سے جمہوریت،آئین اور وفاقی حکمرانی کے اصولوں پر چلنے کی عادت نہیں رہی تھی،اس لیے سیاسی مقاصد کے لیے بار بار مذہب کا استعمال ہوتا رہا ہے اور یہاں دہشتگردی پروان چڑھتی آئی ہے۔

بنگلہ دیش کا سانحہ ہمارے لیے یہ سبق تھا کہ پاکستان میں ریاست اور قومیت کی تشکیل مذہب کے نام پر نہیں کی جاسکتی اس کے لیے جمہوریت،آئین اور وفاقی اصول پر آگے بڑھنا ہوگا۔پاکستان جیسا متنوع معاشرہ صرف آئینی، پارلیمانی اور وفاقی نظام حکمرانی کے ذریعے ہی ترقی وخوشحالی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ جمہوری ریاست مذہبی اعتبار سے غیر جانبدار ہوتی ہے۔ایک مذہبی ریاست میں فرد سے زیادہ غیر ماوراء ہستیوں اور ان سے منسوب فلسفے اور نظاموں کو اہمیت دی جاتی ہے اور جب کسی مذہبی گروہ کو ریاست میں مذہبی قوتوں کی تشریح وتوضیح کے اختیارات دیتے جاتے ہیں تو اس سے آمریت اور انتہا پسندی کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور بہت سے طبقات اور گروہوں کے بنیادی انسانی حقوق سلب ہوتے ہیں۔اس سے ریاست کا منفی نتیجہ تھیوکریسی، بادشاہت اور آمریت کی صورت میں نکلتا ہے اور بادشاہ اور آمر خود کو خدا کا نمائندہ ظاہر کرنے لگتے ہیں۔عوام کو ایسے معاشرے میں مذہبی اختلاف رائے کی اجازت دی جاتی ہے اور نہ ہی آزاد سیاسی عمل کی ،جبکہ اس کے برعکس جمہوری ریاستیں شخصی آزادیوں سماجی ذمہ داریوں کے ساتھ عوامی نمائندہ اداروں کی بالادستی پر زور دیتی ہیں۔جمہوریت اختیارات،قوت اور فیصلہ سازی کو طاقتور گروہوں کے ہاتھ میں مرتکز نہیں کرتی بلکہ عوام کو ووٹ کے ذریعے با اختیار کر کے اپنے نمائندے منتخب اور مسترد کرنے کا حق دے کر ان کے ذریعے قانون سازی اور پالیسی سازی کے اختیارات دیتی ہے۔آزاد اور ذمہ دار میڈیا کا تصور جمہوری نظام کی ارتقاء سے ہی ممکن ہوا ہے۔بہت سے حوالوں سے آج کا میڈیا ماضی کی نسبت بہت زیادہ متحرک اور اپنے اندر ماضی کی نسبت بہت زیادہ وسعت رکھتا ہے۔پاکستان میں جمہوری ارتقاء کی وجہ سے ایک اہم اور مثبت پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں بشمول مذہبی سیاسی جماعتوں نے آئین کی بالادستی اور جمہوریت کو بہترین نظام حکومت تسلیم کر لیا ہے اور اس بات پر بھی بظاہر تمام سیاسی جماعتیں متفق دکھائی دیتی ہیں کہ فیصلے منتخب نمائندے پارلیمان میں ہی طے کریں گے۔یہ یقین اور ایمان ایک جدید جمہوری ریاست کی جانب سفر کو آسان بنائے گا۔

انسانی تہذیب کے صدیوں پر پھیلے ارتقائی سفر میں انسانی دانش نے ٹرائل اینڈ ایرر کے بعد تمام سیاسی نظاموں،آمریت،بادشاہت،سوشلزم،کیمونزم،نازی ازم،فاشزم،اور دیگر سیاسی نظاموں کو مسترد کرتے ہوئے جمہوریت کو اپنے لیے منتخب کیا ہے،یہ بھی درست ہے کہ ایک سماجی سائنسی نظام کے طور پر

جمہوریت میں خامیاں ہوسکتی ہیں مگر ان خامیوں کا تدارک مزید جمہوریت ہی سے ممکن ہے یہی بہتر انداز حکمرانی کی جستجو ہمیں آگے کی جانب دھکیل رہی ہے۔

جمہوری جدوجہد کے ذریعے معرض وجود میں آنے والے پاکستان کی بقاء اور خوشحالی کا انحصار جمہوریت کے رواں سال ۱۱ مئی ۲۰۱۳ ملکی تاریخ میں ایک یادگار دن کے طور پر رقم ہوگا کیونکہ یہ ایک منتخب تسلسل میں پنہاں ہے۔ جمہوری پارلیمان اور حکومت نے پہلی دفعہ اپنی آئینی مدت پوری کی ہے اور قوم کو جمہوری راہ پر گامزن کر دیا گیا ہے۔

صدر مملکت آصف علی زرداری کا کہنا ہے کہ یہ دراصل ایک عظیم کامیابی ہے اور جمہوریت، وفاقیت اور آئین کی بالادستی کے حصول کے لئے قوم کی جستجو میں ایک سنگ میل ہے جس کے لئے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔

یہ مضمون خصوصی طور پر فرد میگزین کے لئے لکھا گیا ہے جس کے لئے ہم مصنف کے شکر گزار ہیں۔

مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

فاٹا کی آنکھ سے

سیف الاسلام سیفی

ملک کے دیگر حصوں کی طرح خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقہ جات (فاٹا) میں بھی سیاسی اور انتخابی سرگرمیاں شروع ہو چکی ہیں۔ یہ عمل صوبے میں تو بہت تیز تاہم قبائلی علاقوں میں سست یا بہت کم ہے۔ اس کی بنیادی وجہ قبائلی علاقوں میں امن وامان کی غیر تسلی بخش بلکہ تشویشناک صورتحال ہے۔ جنوبی وزیرستان اور خیبر ایجنسیوں سے تو ہزاروں خاندان نقل مکانی کر چکے ہیں، قبائلی علاقوں میں جنوبی وشمالی وزیرستان، اورکزئی، کرم، باجوڑ ومہمند ایجنسیوں کے بعض علاقے تو براہ راست ایسی کاروائیوں کی زد میں ہیں جن کی وجہ سے یہاں معمول کی زندگی معطل ہے اور یہاں اس صورتحال میں انتخابی سرگرمیاں تو درکنار انتخابات کا انعقاد ایک بڑا سوال بن گیا ہے۔ اس مشکل مرحلے کی تکمیل حکومت، سیکورٹی اداروں اور پولیٹکل انتظامیہ کے لئے ایک چیلنج ہے۔ جنوبی وزیرستان کے ایک ایم این اے مولانا معراج الدین کے قتل کے بعد گزشتہ تقریباً تین سال سے یہ نشست خالی رہی اور یہاں ضمنی انتخابات ممکن نہ ہو سکے اور اس حلقے کی ایک بڑی آبادی وادی گومل، ڈیرہ اسماعیل خان اور دوسرے شہروں کو نقل مکانی کر چکی ہے۔ اسی طرح خیبر ایجنسی کے علاقے باڑہ میں گزشتہ ساڑھے تین سالوں سے کرفیو نافذ ہے اور خیبر ایجنسی کے علاقوں باڑہ اور تیراہ کے ہزاروں خاندان نقل مکانی کر کے جلوزئی کے آئی ڈی پی کیمپ یا دوسری جگہوں میں رہ رہے ہیں۔ مہمند، باجوڑ، اورکزئی اور کرم ایجنسیوں سے نقل مکانی کرنے والے خاندانوں کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔ دہشت گردی کے واقعات خیبر پختونخوا کا روز کا معمول بھی بن چکے ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ دہشت گردی کا کوئی واقعہ رونما نہ ہوتا ہو، چند روز قبل پشاور کے حساس علاقے خیبر روڈ پر واقع جوڈیشل کمپلیکس پر حملہ کیا گیا جہاں ان دنوں ریٹرننگ افسران کے پاس انتخابات کے لئے کاغذات نامزدگی جمع کرانے والے امیدواروں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور یہ جگہ انتخابات کے پہلے مرحلے کا مرکز بنا ہوا ہے صوبے کی ایک بڑی سیاسی شخصیت اور سبکدوش ہونے والی خیبر پختونخوا حکومت کے سینئر وزیر بشیر احمد بلور انتخابی تیاریوں کے حوالے سے منعقد ہونے والے پارٹی کارکنوں کی ایک کارنر میٹنگ میں شرکت کی موقع پر ہی دہشت گردی کا نشانہ بنے، اسی طرح اپنی حکومت کے آخری دنوں میں مردان میں ایک سیاسی جلسے میں شرکت کے لئے جانے والے وزیر امیر حیدر ہوتی کو خودکش دھماکے میں مارنے کی کوشش کی گئی جو ناکام رہی۔ چند روز قبل بنوں میں رابطہ عوام مہم کے ایک جلسے میں سابق ایم پی اے عدنان وزیر زخمی ہوئے اور خیبر پختون خواہ میں آئے روز سیکورٹی فورسز کو ایسی کاروائیوں میں نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان واقعات کے باوجود سیاسی قیادت اور نگران حکومت ہر حال میں

انتخابات کے انعقاد کے لئے پرعزم ہیں۔ اس سے قبل انتخابات کے لئے ماحول کو پرامن بنانے کی غرض سے عوامی نیشنل پارٹی نے طالبان کو مذاکرات کی پیش کی حالانکہ اس سے قبل عوامی نیشنل پارٹی دہشت گردی کا طاقت کے ذریعے مقابلہ کرنے کی مستقل پالیسی پر گامزن تھی اور اس کے دو دوسرے ایم پی ایز عالمزیب خان (پشاور) اور ڈاکٹر شمشیر علی (سوات) اور درجنوں رہنما اور کارکنان دہشت گردی کی کاروائیوں کے بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اے این پی نے طالبان سے مذاکرات پر دوسری سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لینے کے لئے آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد بھی کیا مولانا فضل الرحمان نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے قبائلی گرینڈ جرگے کے ذریعے طالبان سے مذاکرات

کرنے کے طریقہ کار پر سیاسی قیادت کو اعتماد میں لینے کے لئے آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کیا اور فاٹا کے چیف ایگزیکٹیو گورنر خیبر پختونخوا کے ساتھ گرینڈ قبائلی جرگے کے ہمراہ ایک تفصیلی ملاقات بھی کی تا کہ مذاکرات کے لئے عملی اقدامات اٹھائے جائیں کیونکہ عوامی نیشنل پارٹی کی طرح جے یو ائی کے سیاسی مفادات بھی فاٹا اور خیبر پختونخوا سے وابستہ ہیں اور انتخابات میں امن دوسری جماعتوں سے بڑھ کر ان کی ضرورت ہے کیونکہ پولیٹکل پارٹیز ایکٹ کو فاٹا تک وسعت دینے کے بعد پہلی بار سیاسی جماعتوں کو فاٹا میں سیاسی سرگرمیوں کی آزادی حاصل ہوئی ہے اور پہلی بار یہاں سے امیدوار کسی پارٹی کے انتخابی نشان پر الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ ۱۹۹۶ کے بعد فاٹا میں ایک بڑی سیاسی پیش رفت ہے اس وقت کے صدر فاروق لغاری نے فاٹا کے باشندوں کو بالغ رائے دہی کے ذریعے اپنے نمائندے قومی اسمبلی بھجوانے کا حق دیا تھا، اس سے قبل ایجنسی کے چند ہزار مراعات یافتہ مشیران کو ہی ووٹ کا حق حاصل تھا اس لئے مذاکرات کی کامیابی اور قیام امن کے بعد فاٹا میں سیاسی جماعتوں کو پہلی مرتبہ قانونی حق حاصل ہونے کے بعد اپنی سرگرمیاں جاری رکھنا ممکن ہو پاتا۔ طالبان نے پہلے مذاکرات کی پیشکش کو سیکورٹی فورسز یعنی فوج کے ساتھ بات چیت کی شرط کے ساتھ قبول کیا اور میاں نواز شریف، مولانا فضل الرحمٰن اور پروفیسر منور حسن کو ضامنوں کو درجہ دینے کا اعلان تک کر دیا تاہم کچھ دنوں بعد نہ صرف مذاکرات کی پیش کش واپس لی بلکہ ایک خصوصی پیغام کے ذریعے پاکستان پیپلز پارٹی، متحدہ قومی موومنٹ اور عوامی نیشنل پارٹی کے جلسوں کو نشانہ بنانے اور عوام کو ان جلسوں سے دور رہنے کا اعلان کیا۔ اس دوران مولانا فضل الرحمٰن نے مذاکرات میں حکومت کی عدم دلچسپی اور قبائلی جرگے کی حوصلہ شکنی کا الزام لگایا اور عسکری قیادت نے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ کی پالیسی جاری رکھنے کا اعلان کیا اور اب خیبر پختونخوا کے گورنر نے طالبان سے مذاکرات شروع نہ ہو سکنے کا اعتراف کر لیا ہے، اس طرح قیام امن کے لئے مذاکرات کی خواہش دم توڑ گئی ہے۔ یہ صورت حال فاٹا میں خصوصی اور خیبر پختونخوا میں عمومی طور پر انتخابی ماحول پر اثر انداز ہوگی یہی وجہ ہے کہ آئینی طور پر سیاسی آزادی کا حق حاصل ہونے کے باوجود فاٹا میں سیاسی سرگرمیاں اور جلسہ جلوس نہ ہونے کے برابر ہیں اور انتخابات میں حصہ لینے والے امیدوار بند حجروں میں محدود جرگوں تک ہی محدود ہیں۔ خیبر اور مہمند ایجنسیوں سے الیکشن میں حصہ لینے کے خواہش مند امیدواروں نے پشاور کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہوا ہے کیونکہ ان دونوں ان علاقوں کے قبائل کی ایک بڑی تعداد پشاور میں ہے اور یہ دونوں ایجنسیاں پشاور سے قریب بھی ہیں۔ فاٹا کی بارہ قومی اسمبلی کی نشستوں کے لئے ۱۲۰ سے زائد امیدواروں نے کاغذات نامزدگی جمع کروائے ہیں، ان میں سیاسی جماعتوں کے ٹکٹ یافتہ اور آزاد امیدوار شامل ہیں۔ خیبر پختونخوا میں قومی اسمبلی کی ۳۵ صوبائی اسمبلی کی ۹۹ جنرل نشستوں کے لئے مجموعی طور پر ۲۵۰۰ سے زائد امیدواروں نے کاغذات نامزدگی جمع کروائے ہیں۔ امیدواروں کی یہ تعداد ماضی کے کسی بھی انتخابات کے امیدواروں سے زیادہ بتائی جارہی ہے اور صوبے میں امن وامان کی تشویشناک صورتحال کی وجہ انتخابات سے لوگوں اور سیاسی جماعتوں کے لاتعلق رہنے کے جو خدشات ظاہر کئے جارہے تھے موجودہ جوش وخروش سے یہ خدشات بھی غلط ثابت ہورہے ہیں اور عام لوگوں کی انتخابات میں شرکت اور ووٹوں کے ٹرن آؤٹ کی شرح بھی ماضی کے مقابلے میں زیادہ ہونے کا امکان ہے۔ امیدواروں کے کاغذات کی جانچ پڑتال کا عمل جاری ہے امیدواروں کی اہلیت پر اعتراضات، جعلی ڈگری، دوہری شہریت اور دوسرے الزامات کے تحت امیدواروں کی نااہلی اور ان فیصلوں کے خلاف اپیلوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ان میں سابق صوبائی وزیر کھیل سید عاقل شاہ ایک دن کی جیل یاترا بھی کر چکے ہیں، اگلے روز وہ ضمانت پر رہا ہو کر باہر آ گئے۔ اسی طرح ڈیرہ اسماعیل خان کے ایم پی ایز خلیفہ عبدالقیوم اور کشور کمار اور صوابی کے سردار علی اور جاوید تر بھی ان الزامات کے تحت سزاوار قرار دیے گئے ہیں۔ انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (ن) پاکستان تحریک انصاف، عوامی نیشنل پارٹی، جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، پاکستان مسلم لیگ (ق) پاکستان مسلم لیگ ہم خیال، متحدہ دینی محاذ، جمعیت علمائے اسلام (نظریاتی)، قومی وطن پارٹی، پیپلز پارٹی شہید بھٹو، پختونخوا ملی عوامی پارٹی سمیت دو درجن کے قریب سیاسی جماعتوں کے امیدواروں نے کاغذات جمع کروائے ہیں۔ متحدہ قومی موومنٹ نے پہلی بار خیبر پختونخوا میں کئی حلقوں پر اپنے امیدوار کھڑے کئے

ہیں تاہم بڑی جماعتوں میں امیدواروں کی بہتات ہے اور ایک ہی پارٹی کے کئی کئی امیدوار سامنے آئے ہیں اور پارٹی ٹکٹوں کی تقسیم پر ان جماعتوں میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ آئے روز ان اختلافات کے حوالے سے خبریں اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ سب سے زیادہ کاغذات نامزدگی پاکستان تحریک انصاف کے امیدواروں نے جمع کروائے ہیں اور سب سے زیادہ اختلافات بھی اس کی صفوں میں نظر آرہے ہیں تحریک انصاف حال ہی میں انٹرا پارٹی الیکشن کے ایک مشکل مرحلے سے گزری ہے۔ پارٹی عہدوں پر باہم مدمقابل گروپ پہلے ہی اختلافات کا شکار رہے ہیں تاہم تحریک انصاف کا پارٹی کے اندر انتخابات کروانے کے حقیقی جمہوری اقدام کو سیاسی حلقوں میں پذیرائی ضرور حاصل ہوئی ہے۔ سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کا موسم بھی اپنے عروج پر ہے اور موقع پرست سیاستدان اپنے لئے ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے نالاں اور باغی ہوگئے ہیں۔ تاحال انتخابی اتحاد اور سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے حوالے سے سیاسی جماعتوں کے درمیاں ہونے والے مذاکرات ابھی تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکے ہیں حالانکہ میاں نواز شریف اور مولانا فضل الرحمٰن کئی ہفتے قبل باہمی انتخابی تعاون کا اعلان کرچکے ہیں۔ اسی قسم کا اعلان عمران خان اور پروفیسر منور حسن بھی کرچکے ہیں اور سیاسی جماعتوں کی مذاکراتی ٹیمیں مشترکہ اجلاس میں مصروف ہیں اور ہر جماعت ان مذاکرات کے نتیجے میں اپنے لئے زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

سیاسی مفادات کے اس تصادم ہی کو انتخابی تعاون یا سیٹ ٹو سیٹ ایڈجسٹمنٹ کہا جاتا ہے اور یہی ایک بنیادی رکاوٹ ہے اور کوئی سیاسی جماعت وسعت قلبی یا قربانی کے جزبے کا مظاہرہ کرنے پر تیار نہیں۔ یہاں تک کہ مذہبی جماعتیں بھی تقسیم ہیں متحدہ مجلس عمل کی بحالی کے دعوے غلط ثابت ہوگئے اور اس وقت مذہبی جماعتوں کی ایک دوسرے پر الزام تراشی اور مخالفانہ بیان بازی زوروں پر ہے۔ ہر حلقے سے چار چار مذہبی جماعتوں کے امیدوار میدان میں اترے ہوئے ہیں جس سے مذہبی ووٹ تقسیم ہوگا۔ صوبے میں سیاسی جماعتوں نے اپنے بیشتر حلقوں کے لئے امیدواروں کے ناموں کا اعلان کردیا ہے لیکن حلقوں کے لئے اپنے اعلان کردہ امیدواروں میں تبدیلی لانے کا سلسلہ بھی جاری ہے

انتخابی عمل میں ٹکٹوں کی تقسیم کا یہ مرحلہ سیاسی قیادت کے لئے ایک مشکل مرحلہ ثابت ہوا ہے تاہم جوں توں کرکے پہلا مرحلہ تقریباً مکمل کرلیا گیا ہے۔ اگلا مرحلہ کاغذات نامزدگی درست یا غلط قرار دینے کا، اپیلوں اور اعتراضات کے فیصلوں اور امیدواروں کی حتمی فہرستوں کا اجرا ہے۔ سیاسی برتری کے لئے سیاسی حربوں کا استعمال شروع ہوچکا ہے اور مدمقابل پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لئے دعوے کئے جارہے ہیں۔ پاکستان تحریک انصاف، عوامی نیشنل پارٹی، پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (ن)، جمعیت علمائے اسلام (ف) اور جماعت اسلامی انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے اور حکومت تشکیل دینے کے بار بار دعوے کررہی ہیں اور ان دعووں میں بعض جماعتیں کافی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نظر آرہی ہیں یہاں تک کہ ان جماعتوں کی رابطہ عوام مہم میں بعض رہنماؤں کا مستقبل کے وزیراعلیٰ اور دوسرے عہدوں کے حوالے سے پکارا جاتا ہے۔ خیبر پختونخوا کے مستقبل کے وزیراعلیٰ کی دوڑ میں پیپلز پارٹی کے انور سیف اللہ خان، جے یو آئی (ف) کے اکرم خان درانی، مولانا فضل الرحمان کے بھائی مولانا لطف الرحمان اور سمدھی سینیٹر حاجی غلام علی، جماعت اسلامی کے سراج الحق، تحریک انصاف کے پرویز خٹک، اعظم سواتی اور اسد قیصر، مسلم لیگ ن سردار مہتاب عباسی، امیر مقام اور پیر صابر شاہ شامل ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) اور جماعت اسلامی نے بڑے جلسے کرکے اپنی قوت کے مظاہرے کئے ہیں تاہم پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی بڑے جلسے منعقد نہیں کررہیں اور ان کی سیاسی سرگرمیاں کارنر میٹنگز تک محدود ہیں انتخابی بخار چند دنوں میں اپنے عروج تک پہنچ جائے گا، شہر میں سیاسی جماعتوں اور امیدواروں کے بڑے بڑے بل بورڈز الیکشن کمیشن کی انتخابات کے لئے بنائے گئے ضابطہ اخلاق پر عمل در آمد کے لئے ہٹادیے گئے ہیں اور چھوٹے اشتہارات پر اکتفا کیا جارہا ہے

فاٹا اب پاکستان کا حصہ بن چکا ہے جو شاید بلوچستان کے صحراؤں سے زیادہ کھٹن اور پنجاب سے زیادہ اہم ہوگیا ہے۔ آنے والے وقت میں فاٹا پاکستان کی ترقی میں کیا اہم کردار ادا کرتا ہے؟ یہ کہنا غلط نہ ہوگا ملک کے کچھ اہم مسائل کا حل فاٹا کی ڈویلپمنٹ میں ہے۔ فاٹا پہلی بار عام انتخابات میں صحیح طریقے

سے حصہ لے رہا ہے، جو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا اب ہو رہا ہے۔ فاٹا کو عملی سیاست تک آتے آتے بہت وقت لگے گا۔ لیکن جو ہو چکا ہے اب اس پر سوچنے کا وقت نہیں بلکہ اب آگے دیکھنے اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا وقت ہے۔ اور ترقی کی پہلی سڑھی یہ ہی ہے کہ عام انتخابات کو وقت پر اور صحیح طریقے سے عمل میں لایا جائے۔

یہ مضمون خصوصی طور پر فرد میگزین کے لئے لکھا گیا ہے جس کے لئے ہم مصنف کے شکر گزار ہیں۔

مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

الیکشن 2013ء سیاسی جماعتوں کی مارکیٹنگ کمپئین

جنید قیصر

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک عوام کی منتخب جمہوری حکومت نے اپنی آئینی معیاد مکمل کی ہے، اوراس کی بعد آزاد متفقہ الیکشن کمیشن کے تحت انتخابات ہونے جارہے ہیں، جس کے ذریعے پرامن جمہوری انتقال اقتدار کا عمل ہوگا، آئینی میعاد کی تکمیل یقینی اعتبار سے جمہوری حکومت کی ایک بڑی کامیابی ہے، اوراس بات کا کریڈٹ جمہوری سیاسی قوتوں کو جاتا ہے کہ انہوں نے دانشمندانہ حکمتِ عملی اور مفاہمت کے ذریعے ۵ سال اس نظام کو چلایا ہے۔

پاکستان میں یہ اعزاز بھی جمہوری سیاسی قوتوں، خاص طور پر سابقہ پارلیمنٹ میں موجود سیاسی جماعتوں کو جاتا ہے کہ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک بااختیار اور متفقہ الیکشن کمیشن موجود ہے۔ حتیٰ کہ جس طرح انتخابی عمل آگے بڑھایا جارہا ہے اس سے یہ تاثر بھی سامنے آیا کہ الیکشن کمشن اپنے مینڈیٹ سے بڑھ کے اختیارات میں اضافے کا خواہاں ہے اور وہ الیکشن کرانے کے ساتھ ساتھ سیاسی نظام کو بھی کنٹرول کرنے جارہے ہیں مثلاً امیدواروں کے لیے جو فارم بنائے گئے ہیں، ان کے انتخابی حلقہ میں خدمات جانچنے کا فریضہ بھی الیکشن کمیشن خود سر انجام دے رہا ہے اور ساتھ ہی کارپوریٹ میڈیا کو بھی اس ضابطہ اخلاق کے تحت کنٹرول کرنے کی کوشش ہوئی ہے۔ پریس کونسل نے متوقع ضابطہ اخلاق کو مسترد کیا ہے اور میڈیا کے نمائندوں نے اسی صورت میں سپریم کورٹ جانے کی دھمکی بھی دی تھی، علاوہ ازیں پارلیمنٹیرینز کی طرف سے بھی ایک ردِعمل دیکھنے کو ملا، جب ایک خط کے ذریعے الیکشن کمیشن کی طرف سے اراکین اسمبلی سے ڈگریوں کی تصدیق طلب کی گئی۔ اس سلسلے میں کمیشن کے ڈائریکٹر لیگل کی طرف سے جو خط لکھا گیا، اسے حزب اختلاف کے قائد چوہدری نثار علی خان نے توہین آمیز جانا اور پارلیمنٹ میں احتجاج کیا تو سب متفق ہوگئے کیونکہ 232 کے قریب اراکین متاثر ہورہے تھے۔ چیف الیکشن کمیشنر نے اس پر چوہدری نثار کو فون کرکے بات کی تو یہ تاثر دیا گیا کہ خط واپس لے لیا گیا اور معذرت بھی کی گئی، لہذا معاملہ بظاہر ختم ہوا، لیکن الیکشن کمیشن کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ خط کے انداز اور طرز تحریر پر معذرت ہوئی تھی مگر ڈگریوں کی تلوار آج بھی امیدواروں کے سر پر لٹک رہی ہے۔ یوں اب الیکشن کمیشن اور منتخب اراکین آمنے سامنے ہیں۔

الیکشن کمیشن کا ادارہ بھی ہمیشہ تنقید کی زد میں رہا ہے کہ وہ اپنی ذمے داریاں جمہوری انداز میں سرانجام دینے سے یکسر قاصر رہا ہے۔ یہاں انتخابی عمل کے غیر جانبدار، منصفانہ اور شفاف ہونے کے حوالے سے ہمیشہ ہی شبہات اور اعتراضات اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ اب بھی سکروٹنی کے مرحلے میں امیدواروں سے جس نوعیت کے سوالات پوچھے گئے ہیں، اس نے جگ ہنسائی کے ساتھ تشویش کو بھی جنم دیا ہے۔ اسی مرحلے میں معروف کالم نگار ایاز امیر کے کاغذات نامزدگی ریٹرننگ افسر نے مسترد کردیئے ہیں اور اسکا جواز ان کے بعض اخباری کالموں کو بنایا گیا ہے۔ ایاز امیر پاکستان کے کثیر الاشاعت انگریزی اخباروں کے لیے پچھلی دو دہائیوں سے ہفتے وار کالم لکھتے آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ریٹرننگ افسر کے فیصلے کے خلاف اپیل داخل کریں گے کیونکہ یہ اظہار رائے کی آزادی کے بنیادی آئینی حق پر قدغن کے مترادف ہے۔ ممتاز قانون دان طارق محمود کا کہنا ہے کہ الیکشن کمیشن آزاد نہیں بلکہ میڈیا اور عدالت زیر اثر ہے۔

ایک بااختیار الیکشن کمیشن غلطیوں سے پاک ایک نئی انتخابی فہرست کے ساتھ ''آزاد عدلیہ'' بہرکیف موجود ہے اور اب ۱۱ مئی ۲۰۱۳ء میں ۹۰ ملین ووٹرز اپنے ووٹ کا استعمال کرنے جارہے ہیں جس میں سے تقریباً 30 ملین نئے ووٹرز بھی ہیں۔

سیاسی معاشرے میں سیاسی جماعتوں اور سیاستدان اپنی پارٹی کے نام، انتخابی نشان، نعرے اور بنیادی پروگرام یا منشور کو عوام تک پہنچانے کے لئے کمرشل

پروڈکٹ کی مارکیٹنگ کرنے والے سے بڑھ کے مارکیٹنگ کی بنیادی تکنیکوں پر عمل کرتے ہیں۔ یہ اپنے پیغام کو عوام جو کہ ان کے لئے ٹارگٹ گروپ ہے تک پہنچانے کے لیے ذرائع ابلاغ، پوسٹرز، فلیکس، اشتہارات، وال چاکنگ، ریلیوں، بینرز، جلسے جلوس، پریس کانفرنس اور اب سوشل میڈیا کو بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ جس طرح کمرشل کمپنیاں مستقل اس جدوجہد میں رہتی ہیں کہ وہ صارفین کے لیے افادیت سے بھرپور پروڈکٹ مارکیٹ میں لے کر آئیں، اسی طرح سیاسی جماعتیں بھی عوام کی ضروریات کے مطابق پروگرام اور پالیسیاں بالخصوص انتخابات کے موقع پر لاتی ہیں۔ انتخابی معرکے کی اس فضاء میں مخالف سیاسی جماعتوں اور سیاسی حالات و واقعات کا تجزیہ اور تحقیق بھی کی جاتی ہے، تاکہ کامیابی کے لیے عوامی رائے عامہ کو ایک مخصوص سمت میں لے کر جایا جائے، اور اپنے نظریات اور پروگرام کو آگے بڑھاتے ہوئے انتخابات میں کامیابی حاصل کی جاسکے۔

ایک صحتمند معاشرے اور جمہوریت میں سیاسی جماعتوں کا ووٹروں سے رابطہ رکھنا ایک اہم ترین کام ہے، سیاسی جماعتوں اور امیدوار انتخابی مہم کے لیے کمیونیکیشن کے مختلف نوعیت کے طریقہ کار اختیار کرتے ہیں تاکہ اپنی پارٹی کے لیے سپورٹ حاصل کرسکیں اور ان کی رائے عامہ پر اثر انداز ہوکر کامیابی حاصل کرسکیں۔ یہ ایک طرح سے براہ راست سیاسی انتخابی مارکیٹنگ ہے۔ الیکشن جیتنے کی ایک اہم حکمتِ عملی ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جس میں ''انتخابی مہم'' میں انتخابات کے قریب آتے ہی تیزی آجاتی ہے جو آجکل ہمیں ہر طرف نظر آرہی ہے، ٹیلی ویژن پر سے لے کے ایس۔ ایم۔ ایس مہم تک، انتخابات کے فیصلہ کن مراحل میں آتے ہی پارٹیاں ''ایڈورٹائزنگ'' عوام تک پہنچانے کے لیے ان کی حمایت اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے منشور اور پروگرامز کی تشہیر کرتی نظر آرہی ہیں۔

سیاسی انتخابی مہم ایک منظّم کاوش ہوتی ہے جس کا بنیادی حدف ووٹرز اور مقصد انتخابات میں کامیابی کے ذریعے اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ کامیاب مہم کے لیے درست اور موثر مہم ضروری ہے۔ مہم کا پیغام ان آئیڈیاز پر مشتمل ہوتا ہے جو سیاسی جماعتوں ووٹرز کی توجہ، حمایت اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ پروگرام متعدد پالیسی ایشوز پر مبنی ٹاکنگ پوائنٹس پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ نکات مہم کے ان بنیادی خیالات کا خلاصہ ہوتے ہیں جن کو بار بار ووٹرز کے سامنے دہرایا جاتا ہے تاکہ طویل المیعاد اور دیرپا اثرات عوام کے دل و دماغ پر چھوڑے جاسکیں۔ ایک سیاسی معاشرے میں، احتجاج، ریلیاں، جلسے، کارنر میٹنگز اور دیگر تقریبات اور پارٹی کے ترانے انتخابی مہم کے انتہائی اہم حصے تصور کیے جاتے ہیں۔ آجکل ہم ایک ڈیجیٹل ایج میں سانس لے رہے ہیں۔ جس میں انٹرنیٹ اور جدید سیاسی انتخابی مہم ایک اہم ترین جزو بن گیا ہے۔ یہ جدید ٹیکنالوجی جیسا کہ ای میل، ویب سائٹس، بلاگ، ٹویٹر، فیس بکس کے گروپس اور پیجز، پوڈکاسٹ، یوٹیوب آن لائن تیز ترین کمیونیکیشن کو آسان بنا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کے، خاص طور پر شہری تحریکوں کے ویڈیوز تصورات کو ایک نئی جدت اور وسعت بخشتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ آزاد امیدوار بھی اب اس کا استعمال کررہے ہیں۔

الیکشن کمیشن کا حالیہ ضابطہ اخلاق ماضی کے مقابلے میں نسبتاً سخت ہے جو روایتی پولیٹکل مارکیٹینگ کی حکمتِ عملی کو تبدیل کرنے جارہا ہے۔ جس میں امیدوار اشتہار بازی اور کامیابی کے حصول کے لئے بے تحاشا اخراجات کرتے نظر آتے تھے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان نے سپریم کورٹ کے احکامات کی روشنی میں جو نیا انتخابی ضابطہ اخلاق جاری کیا ہے۔ اس نوٹیفکیشن کے مطابق امیدواروں کو

قومی اسمبلی کے لئے پندرہ لاکھ اور صوبائی اسمبلی کے لئے دس لاکھ روپے تک کے اخراجات کی اجازت ہوگی۔ الیکشن کمیشن نے تمام امیدواروں کو چار اپریل سے قبل مخصوص بینک اکاؤنٹ کھلوانے کی ہدایت بھی کی ہے اور قرار دیا ہے کہ اس اکاؤنٹ کے علاوہ انتخابی اخراجات کی ہرگز اجازت نہیں ہوگی۔

تردید

جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل لیاقت بلوچ نے میڈیا پر چلنے والی اس خبر کی تردید کی ہے کہ جماعت اسلامی نے پیپلزپارٹی سے اتحاد کے لیے رابطہ کیا ہے۔ لیاقت بلوچ کا کہنا تھا کہ میڈیا نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا کیونکہ فون انھوں نے نہیں میاں منظور وٹو نے کیا تھا اور اس میں دونوں جماعتوں کے درمیان سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ منظور وٹو صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہے تھے کہ جماعت اسلامی اور ن لیگ کے درمیان سیٹ ایڈجسٹمنٹ کا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے۔

میڈیا سیل جماعت اسلامی پاکستان (منصورہ)

میڈیا پر چلنے والی خبر کی تردید۔
میڈیا سیل جماعت اسلامی پاکستان (منصورہ)
Like · Comment · Share · 7 minutes ago ·

امیدواروں کو گیارہ اور پندرہ اپریل کو ریٹرننگ افسر کے پاس اخراجات کی تفصیلات جمع کرانے کے لئے بھی کہا گیا ہے۔ نئے ضابطہ اخلاق کے مطابق مقررہ سائز سے بڑے پوسٹرز، بینرز، اور ہوڈنگ بورڈز کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ وال چاکنگ اور پلک عمارتوں پر پارٹی جھنڈا لہرانا بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ امیدوار جلسے سے ایک ہفتہ قبل مقامی انتظامیہ کو آگاہ کرنے کے پابند ہوں گے، جب کہ پولنگ اسٹیشن کی حدود کے چار سو گز کے اندر پولنگ کیمپ لگانے کی اجازت نہی ہوگی۔

ووٹرز کو پولنگ اسٹیشنز تک لانے کے لئے ٹرانسپورٹ کا استعمال بھی ممنوع قرار دیدیا گیا۔ الیکشن کمیشن ان تمام پابندیوں اور ضابطہ اخلاق پر عمل درآمد کی ویڈیو کیمروں سے لیس ٹیموں کے ذریعے مانیٹرنگ کرے گا، ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے والے امیدواروں کو نا اہل قرار دیا جائے گا۔ اگر سیاسی جماعتیں نئے ضابطہ اخلاق پر عمل پیرا ہوتی ہیں، تو ایسی صورت میں انہیں پولیٹیکل مارکیٹینگ کے لئے جدید فری ڈیجیٹل میڈیا کو استعمال میں لانا ہوگا۔

الیکشن ۲۰۱۳ء کو جہاں پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک نیا سنگِ میل قرار دیا جا رہا ہے۔ وہاں امن و امان کی بدترین صورتحال، دہشتگردی، انتہا پسندی کے سائے، اور فرقہ وارانہ قتل و غارت گری اور خاص طور پر شیعہ ہلاکتوں کی وجہ سے ان کے پرتشدد اور خونی ہونے کا خدشات بھی بڑھ گئے ہیں۔ پاکستان اس وقت دہشت گردی کے ساتھ ساتھ داخلی سطح پر ایک نظریاتی جنگ سے بھی دوچار ہے، اس جنگ میں ایک طرف طالبان مخالف سیاسی جماعتیں ہیں اور دوسری طرف وہ سیاسی جماعتیں ہے جو دہشت گردی اور طالبان کے حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ رکھتی ہیں۔ طالبان جو پاکستان کے دستور اور جمہوری نظام کو نہیں مانتے انہوں نے بڑے واضح انداز میں کہا ہے کہ وہ سیاسی عمل میں شرکت کرنے والے کو ٹارگٹ بنائیں گے، خاص کر پی پی پی، ایم کیو ایم، اور اے این پی کے جلسوں اور ریلیوں کو نشانہ بنائیں گے۔ ۲۰۰۸ء میں بے نظیر کی انتخابی مہم کے دوران ہلاکت لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تک تازہ ہے۔ ایسے میں طالبان مخالف سیاسی جماعتوں کے لیے مہم جاری رکھنا بہت مشکل ہے اور دوسری طرف طالبان کے ساتھ معذرت خواہانہ رویہ رکھنے والی سیاسی جماعتوں کو آزادی ہے کہ وہ اپنے سونامی جیسے جلسے کہیں بھی اور کسی بھی جگہ پر کرسکیں۔ پی پی پی کے نوجوان چیئرمین بلاول بھٹو زرداری کو سکیورٹی خدشات کے پیشِ نظر ملک سے باہر جانا پڑا اور اب اطلاعات یہ ہیں کہ وہ ٹیلی فون اور ریڈیو کے ذریعے اپنی انتخابی مہم کو منظّم اور سیاسی حمایتوں کو متحرک کریں گے اور بڑے جلسوں سے خطاب کرنے سے گریز کریں گے۔ ایم کیو ایم کے قائد ایک طویل عرصے سے اپنی جلاوطنی کی وجہ سے انتخابی مہم کو لندن سے بیٹھ کر چلا رہے ہیں ان کے ٹیلیفونک خطاب کو نہایت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سیکولر لبرل سیاسی جماعتوں کو سیکیورٹی کے نظریاتی اور مذہبی مشکل مرحلے کے بعد انتخابی مہم کے پرخطر مرحلے کو پار کرنا ہوگا۔

پاکستان میں ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۳ء کے دوران جو جمہوریت چلی ہے اس میں مفاہمت کی پالیسی اس نظام کو آگے بڑھانے میں بہت معاون رہی ہے، جس کی وجہ سے جتنی بھی سیاسی جماعتیں 2008ء کے انتخابات میں کامیاب ہوئی تھیں وہ پورے نظام میں کسی نہ کسی حوالے سے اقتدار میں شامل تھیں مثلاً پی پی پی

وفاق، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں اقتدار میں رہی جبکہ پنجاب میں اس کی حیثیت اپوزیشن کی تھی۔ جبکہ پاکستان مسلم لیگ (ن) پنجاب میں حکمران جماعت اور وفاق میں اپوزیشن جماعت تھی۔ اس طرح اس وقت دو طرح کی سیاسی جماعتیں موجود ہیں جو انتخابات لڑنے جا رہی ہیں جن میں ایک وہ جو اقتدار کا حصہ ہیں اور دوسری جو پارلیمنٹ سے باہر تھیں وہ تبدیلی اور نیا پاکستان کا نعرہ لگا رہی ہیں۔ اس کے برعکس پارلیمنٹ کا حصہ رہنے والی سیاسی پارٹیاں اپنی کامیابیوں اور کارکردگی کے پیغامات کے ساتھ ووٹرز کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ کچھ جماعتیں اور افراد ایسے بھی ہیں جو انتخابی عمل کا حصہ نہیں ہیں مگر وہ پھر بھی اربوں روپے اپنی مہم کو منظم کرنے کے لیے خرچ کر رہے ہیں جیسا کہ منہاج لانگ مارچ۔ شاید جمہوریت کے نعرے ''سیاست نہیں ریاست بچاؤ'' منہاج القرآن کے قائد طاہر القادری کے خلاف ایسی مہمات کا مقصد انتخابی عمل پر شکوک وشبہات کی ایک نئی چادر ڈالنا ہو؟

موجودہ الیکشن ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کی بنیاد پر کرایا جائے گا، اس کے مطابق ۷۰ فیصد ووٹرز دیہی اور ۳۰ فیصد شہری ہیں۔ شہری ووٹرز پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا سے نسبتاً زیادہ متاثر ہیں، ان کے ووٹوں کے حصول کے لئے سیاسی جماعتیں ان ذرائع کو مختلف ایشوز پر اپنے پیغام کی تشہیر کے لئے استعمال کرتی جا رہی ہیں، جبکہ ۷۰ فیصد ووٹرز کے لئے روایتی طرز عمل پر انحصار کیا گیا جس میں لنگر، ملاقاتیں اور جلسے جلوس زیادہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی گروہوں کے نمائندوں سے ملاقاتیں بھی انتہائی اہم ہیں۔

۲۰۱۳ء کے انتخابات میں کامیابی اور اپنے پیغامات کی تشہیر کے لئے سیاسی جماعتیں سوشل میڈیا کا استعمال کر رہی ہیں۔ فیس بک سٹیٹس، کمنٹس، تصاویر، خیالات، نظریات سلوگن شیئر کرنا لائیو سٹریمنگ، ہائی ڈیفینیشن ویڈیو، بلاگنگ، اپنی انتخابی مہم کو کامیاب بنانا اور مخالفین کی مہم پر ڈیجیٹل اثرات ڈالنا ہے۔ سوشل میڈیا ایک طاقتور میڈیا بن چکا ہے جو کروڑوں لوگوں تک آپ کے پیغامات کو پہنچا سکتا ہے اور مخالفین کے پیغام کو کاؤنٹر کر سکتا ہے۔ مزید برآں اس انتخابات میں سیاسی جماعتیں کچھ نئی مارکیٹنگ ٹیکنیک استعمال کرنے جا رہی ہیں، جن میں ڈاکومینٹریز، شارٹ فلم اور ویژوئل ڈیزائن کا استعمال ہونے جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ طنز ومزاح پر مبنی خاکے اور پوسٹر بھی سوشل میڈیا پر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہوتے ہی الیکشن سے جڑی معاشی سرگرمیاں بھی عروج پر پہنچ جاتی ہیں اور ہزاروں افراد کو عارضی روزگار بھی مل جاتا ہے۔ یہ سیاسی جماعتوں نے ووٹرز کو ایس ایم ایس کے ذریعے اپنی پارٹی کے حق میں ووٹ دینے کے لئے آمادہ کرنے کے لئے موبائل کمپنیوں سے معاہدے کر لئے ہیں۔ بینرز، پینافلیکس، کھانے کے لئے سیاسی ورکروں کے ساتھ ساتھ یومیہ اجرت پر کام کرنے والے افراد کی بھی ایڈوانس خدمات حاصل کر لی گئی ہیں جبکہ سیاسی جماعتوں نے ٹرانسپورٹ بھی ایڈوانس میں بک کرالی ہے۔ سیاسی جماعتیں انتخابی گانوں کی تیاری پر بھی بھرپور توجہ دے رہی ہیں۔ یہ سیاسی جماعتوں کے منشور اور پیغام کو عوام کے سامنے پیش کرنے میں انتہائی موثر ثابت ہوتے ہیں۔

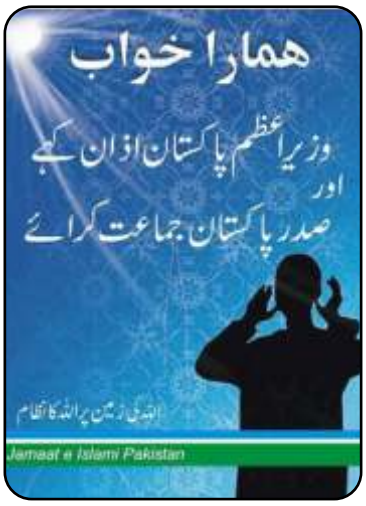

روایتی میڈیا یعنی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں اپنے پیغامات پہنچانے کے دو طریقے کار ہیں۔ ایک آپ ''پیڈ کونٹینٹ'' یعنی میڈیا پر جگہ خریدتے ہیں جو پرنٹ میڈیا پر اشتہارات اور الیکٹرانک میڈیا پر شوز ہیں اسکے علاوہ ٹاک

شوز ہیں اور آج ٹاک شوز جہاں ''میڈیا لبرلائزیشن'' کی صورت میں نظر آتے ہیں، تفریح کا ایک بڑا ذریعہ بنے ہوئے ہیں وہیں یہ اپنے حق میں اور مخالفوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا سب سے بڑا فری پلیٹ فارم بھی ہیں، جہاں روزانہ سیاسی جماعتوں کے نمائندے شام ۸ بجے سے ۱۲ بجے رات تک اپنے حق میں رائے عامہ ہموار اور مخالف سیاسی جماعتوں کے پروپیگنڈہ کو کاؤنٹر کرتے ہیں ۔ کامیاب انتخابی مہم کے لئے ہر سیاسی جماعت اپنے منشور اور عوام کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اپنے پیغام اور حکمت عملی کو ترتیب دے رہی ہے، پاکستان پیپلز پارٹی ایک وفاقی لبرل ترقی پسند سیاسی جماعت ہے جس کے اثاثے میں جمہوریت کے لئے بے تحاشا قربانیاں ہیں، جس میں قائدین کی شہادت سرفہرست ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو پاکستان میں خاص طور پر اندرون سندھ، جنوبی پنجاب میں مقبولیت اور برتری حاصل ہے ۔ یہ جنوبی پنجاب کو نیا صوبہ بنانے کے نعرے کے ساتھ جنوبی پنجاب میں اپنی قوت بڑھا رہی ہے۔اس کے کریڈٹ میں قائدین کی قربانیاں، پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جمہوری آئینی معیاد مکمل کر کے سیاسی تسلسل کو برقرار رکھنا، اٹھارویں ترمیم، آئین کی اصل صورت میں بحالی اور پاک ایران گیس پائپ لائن شامل ہیں۔

پاکستان مسلم لیگ (ن) دوسری بڑی سیاسی جماعت ہے جس کو پنجاب اور بالخصوص وسطی پنجاب میں مضبوطی حاصل ہے، اس کے ووٹ بینک میں کاروباری افراد، پیشہ ور افراد، نظریاتی حوالے سے دائیں بازو کے افراد نمایاں ہیں۔آئندہ انتخابات میں اپنی اصولی سیاست اور پنجاب میں بہتر کارکردگی کے نعرے کے ساتھ جا رہی ہے۔اس کے ساتھ ''ہم بدلیں گے پاکستان'' کے پیغام اور ''گڈ گورننس'' اور ساتھ یہ لیپ ٹاپ اور لاہور میٹرو بس جیسے ترقیاتی منصوبوں کو بھی کامیابی کے لیے استعمال کر رہی ہے۔

پاکستان تحریک انصاف کرکٹ کی گلیمرس دنیا سے ریٹائرڈ ہونے والے عمران خان کی سیاسی جماعت ہے جس کا نعرہ ۹۰ دن میں کرپشن کا خاتمہ اور امریکی ڈرون کو روکنا ہے۔ان پاپولر سلوگنز اور سوشل میڈیا کے استعمال سے اس نے شہری نوجوان نسل میں مقبولیت حاصل کی ہے۔۲۰۰۸ء کی پارلیمنٹ میں

نمائندگی نہ ہونے کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ یہ جماعت آخری نتائج پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کا ایک بڑا کریڈٹ سوشل میڈیا پر موجود اس کے کارکنوں اور ڈیجیٹل پولیٹیکل مارکیٹنگ کو بھی جائے گا۔ یہ پارٹی نئی تبدیلی اور نئے پاکستان کے نعرے کے ساتھ یوتھ کی توجہ اور ووٹ حاصل

کرنے کی جستجو کر رہی ہے۔

:۔سوشل میڈیا پر ہر سیاسی جماعت اپنے نعروں کے ساتھ کچھ اس طرح موجود ہیں

پیپلز پارٹی: کل بھی بھٹو زندہ تھا آج بھی بھٹو زندہ ہے۔
روٹی کپڑا اور مکان
علم صحت سب کو کام
دہشت گردی سے محفوظ عوام
اونچا ہوا جمہور کا نام

مسلم لیگ نواز: ہم نے بدلا ہے پنجاب ہم بدلیں گے پاکستان۔
تحریک انصاف: کون بچائے گا پاکستان عمران خان

دہشت گردی کی اس فضا میں جب خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے علاقوں میں جہاں انتخابی مہم چلانا انتہائی مشکل کام ہے مگر باوجود اس کے سیاسی جماعتیں اپنے پیغامات پر مبنی پوسٹرز، اشتہارات، بینرز کے ساتھ کھڑی ہیں اور ان ناسازگار حالات میں اپنی انتخابی مہم کے ساتھ مخالف جماعتوں کا مقابلہ کر رہی ہیں جو کہ جمہوریت کے لیے مثبت پیش رفت ہے۔

یہ مضمون خصوصی طور پر فرد میگزین کے لئے لکھا گیا ہے جس کے لئے ہم مصنف کے شکر گزار ہیں۔
مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

بلوچستان میں پرامن انتخابات کا انعقاد؟

ارشاد مستوئی

ملک بھر کی طرح بلوچستان میں بھی انتخابی عمل کو صاف شفاف ، آزادانہ اور منصفانہ بنانے کیلئے امیدواروں کے کردار، ذہنی ،سیاسی اور علمی سطح اور خاندانی پس منظرا ثاثوں اور دینی شعائر سے واقفیت کا کھوج لگانے کیلئے تہطیر اور چھان بین کا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے۔اس عمل کو وقت کی مثبت کروٹ قرار دیا جارہا ہے۔عدلیہ،میڈیا اور الیکشن کمیشن کے طفیل قومی سیاسی دھارا درست سمت محوسفر ہے۔گوکہ ماضی میں انتخابات کی بہار مختلف ہوا کرتی تھی،اب شاید انتخابی نتائج حیرت زدہ کرنے والے ہوں۔ایسے میں بلوچستان میں بلوچ قوم پرست جماعتوں کی جانب انتخابات میں حصہ نہ لینے کا سوال اب بے معنی ہو کر رہ گیا ہے لیکن پرامن انتخابات کا انعقاد آج بھی اپنی جگہ سوالیہ نشان ہے۔ایک طویل عرصہ تک دوبئی میں مقیم رہنے والے بلوچ قوم پرست رہنما سردار اختر مینگل کی پاکستان واپسی اور انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلے کو بلوچستان کے حالات کی بہتری اور ملکی استحکام کے حوالے سے ایک خوش آئند پیش رفت قرار دیا جارہا ہے۔جہاں بلوچستان میں علیحدگی پسندی کی سرحدوں کو چھونے والی خون خرابے کی لہر سے وفاق کی وحدت وسلامتی پر خطرات کے گہرے بادل منڈلا رہے ہیں ،وہاں بہت سے حلقوں کا خیال ہے کہ ایسے مایوس کن حالات میں اختر مینگل امید کی کرن ثابت ہوسکتے ہیں۔یہ امر بھی خوش آئندہ ہے کہ چیف الیکشن کمشنر جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم کی سرکردگی میں الیکشن کمیشن نے خدشات کا ادراک کرتے ہوئے انتخابات میں بلوچستان کے قوم پرستوں سمیت تمام سیاسی جماعتوں کی شمولیت کی راہ ہموار کرنے کے لئے خود آگے بڑھ کر کوششیں شروع کردی ہیں۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ نگران وزیراعظم جسٹس (ر) میر ہزار خان کھوسو کا تعلق بھی بلوچستان سے ہے اور وہ خود بھی تمام بلوچوں کو سیاست کے قومی دھارے میں لانے کی غرض سے ان کے انتخابات میں حصہ لینے کے شدت سے خواہاں اور کوشاں ہیں۔انہوں نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد دبئی میں زندگی گذارنے والے اختر مینگل سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا تھا اور انہیں انتخابات میں شرکت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی ،اس کے تیسرے روز اختر مینگل کی وطن واپسی اور اب اپنی سیاسی جماعت بلوچستان نیشنل پارٹی کے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان ظاہر کرتا ہے کہ نگران وزیراعظم کی پہل بار آور رہی ہے، نہ صرف اختر مینگل بلکہ دوسرے قوم پرست رہنماؤں کو بھی بلوچستان میں لاشیں گرنے اور لاپتہ افراد کے حوالے سے انٹیلی جنس اداروں کے خلاف شکایات ہیں۔اامئی سے پہلے وقت ہے کہ بداعتمادی اور نفرت کی فضاء کو ختم کرنے کے لئے اسٹیبلشمنٹ خود بھی موقع سے فائدہ اٹھائے۔بلوچستان کے مسائل بے حد پیچیدہ اور سنگین ہیں ،لاشیں گرنے اور گمشدگی کے واقعات، بار بار کے فوجی آپریشنوں بالخصوص نواب اکبر بگٹی کے قتل نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔بلوچستان میں معاشرہ جس بری طرح منقسم ہے اور عوام کو مایوسی کی اندھیری سرنگ میں دھکیلا جارہا ہے اسے نظر میں رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اختر مینگل نے سیاست کے قومی دھارے میں شمولیت کے لئے انتخابات میں حصہ لینے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ بلاشبہ ایک ٹھوس اور مثبت پیش رفت ہے ۔ بلوچستان کے قوم پرست یہ استدلال کرتے ہیں کہ معاملات جس نہج پر پہنچ چکے ہیں اس کے پیش نظر ریاست پاکستان کے ساتھ ساتھ اعتماد کی بحالی کے لئے مذاکرات کی کوشش لا حاصل ہے، تاہم بی این پی ایم کے سربراہ سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بداعتمادی، مایوسی،نفرت اور تشدد کے موجودہ ماحول کو ختم کرنے کے لئے کوئی درمیانی راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔نواب اکبر بگٹی کے صاحبزادے طلال اکبر بگٹی اور شاہ زین بگٹی بھی بلوچستان کے مسئلہ کا وفاق اور آئین کے اندر حل چاہتے ہیں، حالات بہتر بنانے کی کوششوں میں ان کی مدد بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔بلوچستان کی سیاست میں بلوچستان نیشنل پارٹی کو اب بھی ایک اعتدال پسند جماعت سمجھا جاتا ہے اور اختر مینگل بدستور ایسی شخصیت مانے جاتے ہیں جنہیں کم وبیش تمام متعلقہ حلقوں کا اعتماد حاصل ہے ،بلوچستان کا مسئلہ سیاسی ،معاشی ومعاشرتی تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے

ہوئے گھمبیر اور گنجلک شکل اختیار کر گیا ہے جب تک تمام پہلو سامنے رکھتے ہوئے اسے حل نہیں کیا جاتا ، اس وقت تک محرومیاں اور دوریاں دور نہیں ہوسکتیں،آغاز حقوق بلوچستان جیسے نمائشی اقدامات سے مسئلہ کے حل میں کوئی مدد نہیں مل سکتی،سندھ اور بلوچستان کی قوم پرست سیاست کے قومی دھارے میں شمولیت کے یقیناً متمنی ہیں،قومی دھارے کی دوسری بڑی جماعت مسلم لیگ (ن) کے ساتھ ان کے قریبی روابط اسی خواہش کی عکاسی کرتے ہیں،اس خواہش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میاں نواز شریف قوم پرست جماعتوں کو سیاست کے قومی دھارے میں لانے کیلئے سرگرمی کے ساتھ جو کوششیں کر رہے ہیں ان میں آگے کی طرف ان کے قدم بڑھتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں ،وفاق کے اتحاد واستحکام کے حوالے سے اسے نیک شگون قرار دینے اور ان کوششوں کو بڑھاوا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔ یہ وقت کی اولین ضرورت اور حالات کا اہم ترین تقاضا ہے،اختر مینگل قوم پرستوں کی انتخابات میں شمولیت کے لئے خوف ودہشت سے پاک سازگار ماحول چاہتے ہیں ۔اس ضمن میں یقین دہانی کرانے کیلئے سیاسی وعسکری قوتوں اور الیکشن کمیشن پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے ،الیکشن کمیشن پہلے سے اپنا کردار ادا کر رہا ہے جس کے ارکان نے چیف الیکشن کمشنر کی قیادت میں کوئٹہ کا دورہ کیا ہے اور وہاں تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کی ہیں ۔اختر مینگل نے الیکشن کمیشن کو ایک خط بھی لکھا ہے جس میں انہوں نے انتخابات سے متعلق اپنے خدشات سے آگاہ کیا انہوں نے کہا کہ ان کی پارٹی کو اسٹیبلشمنٹ سے خطرات کا سامنا ہے،سردار اختر مینگل نے واضح کیا ہے کہ باغیانہ تنازعات میں گھرے بلوچستان کا مسئلہ آنے والے انتخابات سے حل نہیں ہوگا۔وہ تمام حلقے جو ریاستی معاملات میں عمل دخل رکھتے ہیں، اس کے لیے انہیں سنجیدہ کوششیں کرنا ہوں گی ۔ممکن ہے کہ اختر مینگل کی جانب سے الیکشن کمیشن کو لکھا جانے والا حالیہ خط، گذشتہ برس سپریم کورٹ میں سردار اختر مینگل کے پیش ہونے کا ہی ایک فالو اپ ہو اور یہ کوشش بھی اس کا حصہ ہو کہ اعلیٰ عدلیہ ان کے لوگوں کو انصاف کی فراہمی کے لیے ایک اور قدم اٹھائے بلوچستان میں قوم پرست سیاسی تنظیموں کے انتخابات میں حصہ لینے کے اعلان کے بعد گو کہ انتخابات ہونے اور نہ ہونے کا سوال اب بے معنی ہو کر رہ گیا ہے لیکن پرامن انتخابات کے انعقاد کے سامنے اب بھی سوالیہ نشان ضرور ہے۔بلوچستان میں انتخابات میں حصہ لینے والی قوم پرست جماعتوں نے بلا شبہ ایک کٹھن راہ کا انتخاب کیا ہے انہیں اس کی کٹھنائیوں کا بخوبی ادراک ہوگا۔ یہ جماعتیں بلوچستان میں دو طرح کے خطرات کا شکار ہیں ۔ایک طرف بلوچ علیحدگی پسند تنظیمیں ہیں اور دوسری طرف ان کے مدمقابل قائم کی گئی زیرزمین مسلح تنظیمیں، جنہیں مبینہ طور پر ریاستی اداروں کی پشت پناہی حاصل ہے ۔اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تنظیمیں انتخابی عمل پر اثر انداز ہونے کی کتنی قوت رکھتی ہیں ۔اس کے لئے ان تنظیموں کی قوت اور اندرونی ڈھانچے کا جائزہ ضروری ہے۔

Zulfiqar, Shahzada. (2012, May). Why reporters dare. FARD, pg16. Accessed from:http://www.individualland.com/index.php?option=com_rokdownloads&view=file&Itemid=202Accessed on 28th April 2013.

بلوچستان میں اس وقت برسرپیکار زیرزمین مسلح تنظیموں کو آسانی کے لئے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ایک کو پاکستان مخالف اور ایک کو پاکستان پرست تنظیمیں کہا جاسکتا ہے۔اول الذکر میں بلوچ لبریشن آرمی، بلوچ ری پبلکن آرمی، بلوچستان لبریشن فرنٹ،لشکر بلوچستان ، یونائیٹڈ بلوچ آرمی سمیت لگ بھگ اتنی ہی دیگر چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بھی شامل ہیں ۔موخر الذکر میں اہم نام بلوچ مسلح دفاع آرمی اور تحریک نفاذ امن بلوچستان کا ہے، کچھ اور گروہ بھی ہیں جو اس طرح کی کارروائیوں میں خود کو ملوث بتاتے ہیں ۔اسی طرح اگر ان تمام مسلح گروہوں کی جغرافیائی تقسیم کی جائے تو بی ایل اے کی کارروائیوں کا مرکز کوئٹہ سے لیکر بولان، بی آر اے نصیر آباد سے لیکر ڈیرہ بگٹی، لشکر بلوچستان جھالاوان سے بیلہ وحب، جب کہ بی ایل ایف آوران سے لیکر مکران تک سرگرم عمل ہے۔ گو کہ یہ دیگر علاقوں میں بھی وقتاً فوقتاً کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔

لیکن ان کے مرکزی علاقے یہی کہلاتے ہیں۔ دوسری طرف' ان کے مقابلے میں کھڑی کی گئی وہ مسلح تنظیمیں ہیں جن کا ظہور ۲۰۰۸ء کے بعد ہوا۔ یہ ایک طرح سے ریاستی اداروں کی جانب سے بلوچ گوریلوں سے نمٹنے کی نئی حکمت عملی تھی۔ ان میں اہم تنظیم بلوچ مسلح دفاع ہے' جو جھالاوان اور کوئٹہ میں سرگرم عمل رہی ہے۔ تحریک نفاذ امن بلوچستان نے بھی کوئٹہ سمیت مچھ' قلات' مستونگ اور دیگر علاقوں میں کارروائیاں کی ہیں۔ ان زیرزمین تنظیموں کا موقف یہ ہے کہ بلوچ علیحدگی پسند تنظیمیں امریکی اور بھارتی ایجنٹ ہیں اور ایک اسلامی ملک کے خلاف برسرپیکار ہیں' اس لئے وہ ان کے خلاف جنگ میں ہیں۔ جب کہ متاثرہ فریق ان پر مقتدر قوتوں کی پشت پناہی کا الزام لگاتے ہیں۔ بلوچستان میں عمومی خیال یہ ہے کہ بلوچ مسلح دفاع کو جھالاوان میں پنپتے ہوئے علیحدگی پسند رجحانات اور اختر مینگل کی سربراہی کے خاتمے کے لئے سامنے لایا گیا ہے۔ بہرکیف ان متحارب قوتوں کی باہمی چپقلش نے جھالاوان بالخصوص خضدار میں امن وامان کی صورتحال کو مخدوش بنا دیا ہے۔ ایک طرف علیحدگی پسند تنظیموں نے ریاستی اداروں کے لئے مخبری کے الزام میں کئی سیاسی کارکنوں سمیت صحافیوں کو نشانہ بنایا تو دوسری طرف ان تنظیموں نے متاثرہ خاندانوں کی دادرسی کے لئے قبائلی انتقام کا سلسلہ شروع کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خضدار اور اس کا گردو پیش خانہ جنگی کا میدان بن کر رہ گیا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں بلوچستان نیشنل پارٹی کے سربراہ سردار اختر مینگل پر ان کی پارٹی کی جانب سے انتخابات میں شمولیت کا دباؤ تھا۔ زمین پر موجود ان کے پارٹی کے احباب یہ سمجھتے تھے کہ اگر اب بھی وہ اقتدار کی قوت حاصل نہ کر پائے تو ان کا صفایا کر دیا جائے گا اور وہ کچھ نہیں کر پائیں گے۔ پارٹی اور اس کے کارکنوں کو بچانے کیلئے یہ فیصلہ ناگزیر تھا۔ موجودہ حالات میں پارٹی قیادت کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو وہ پارٹی کو انڈرگراؤنڈ کر دیں' یا پھر اقتدار میں شامل ہو جائیں۔ ایک سیاسی جماعت کے باوصف انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو ایک پارلیمانی جماعت کو کرنا چاہئے تھا۔ دوسری طرف مکران میں بعینہ اسی صورت حال کا سامنا ڈاکٹر مالک بلوچ کی نیشنل پارٹی کو ہے۔ جہاں ڈاکٹر اللہ نذر بلوچ کی قیادت میں سرگرم بی ایل ایف نے پارلیمانی سیاست کے راستے مسدود کر دیئے ہیں۔ نیشنل پارٹی اور اس کی قیادت بالخصوص اس عتاب کا شکار رہی ہے۔ اس لئے انتخابات کے اعلان سے قبل ہی مکران اور اس سے ملحقہ علاقوں میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے مسلسل کارروائیاں ہوتی رہی ہیں۔ انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ بی ایل ایف کی موجودگی میں مکران میں انتخابات کا انعقاد سہل نہ ہوگا۔ بی این ایم اور بی آر پی جیسی غیر پارلیمانی سیاسی جماعتیں بھی کسی حد تک اثر انداز ہو سکتی ہیں' لیکن ان جماعتوں کا معاملہ یہ ہے کہ یہ چند مخصوص علاقوں تک محدود ہیں' ان کا دائرہ کار بلوچستان بھر تک وسیع نہیں ہے۔ لگ بھگ یہی صورتحال مزاحمتی تنظیموں کی بھی ہے۔ یہ مختلف علاقوں میں برسرپیکار رہی لیکن مکمل بلوچستان میں دسترس نہیں رکھتیں۔ جہاں جہاں ان کی موجودگی ہے' ظاہر ہے وہاں یہ انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گی۔ مکران اور جھالاوان بالخصوص نشانے پر ہوں گے۔ جہاں تک دائرہ کار کا تعلق ہے تو یہ معاملہ صرف مزاحمتی یا غیر پارلیمانی جماعتوں تک محدود نہیں' لگ بھگ تمام سیاسی جماعتوں کا بھی یہی عالم ہے۔ بلوچستان کا جغرافیہ اس قدر وسیع اور گنجلک ہے کہ کسی جماعت کی بلوچستان بھر میں تنظیم کاری جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ شاید ہی کوئی جماعت ایسی ہے جو نچلی سطح تو دور کی بات' بلوچستان کے تمام تیں اضلاع میں وجود رکھتی ہو۔ اس لئے ان معنوں میں کوئی جماعت بلوچستان بھر کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ نہ صرف جغرافیائی بلکہ لسانی' نسلی اور سیاسی و نظریاتی طور پر بھی بلوچستان اسی طرح منقسم ہے۔ اس لئے یہاں آج تک مجموعی عوامی نمائندہ جماعت ابھر کر سامنے نہیں آ سکی' نہ ہی یہاں کے عوام نظریاتی و فکری طور پر یکسو ہو سکے ہیں۔ اس سارے پس منظر میں یہ بات واضح ہے کہ موجودہ انتخابات کئی معنوں میں بلوچستان کے اہم انتخابات سہی' لیکن یہ یہاں کے عوام کی مجموعی حالت میں کسی قسم کی بہتری نہیں لا پائیں گے۔ بلوچستان کی اکثریتی' بلکہ تقریباً تمام ہی نشستیں آج بھی موروثی ہیں' جن میں اکثریت نوابوں اور سرداروں ہی کی ہے۔ انہیں آج تک نہ کسی نے للکارنے کی ہمت کی ہے نہ ہی ایسی کوئی توقع فی الوقت کی جا سکتی ہے۔ مقتدر قوتیں بھی ان کی ''کارکردگی'' سے مطمئن ہیں۔ انہوں نے نہ صرف عوامی فلاح کا بھی کوئی کام نہیں کیا بلکہ عوام کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر کچھ اس طرح دبایا ہوا ہے کہ اب تک کوئی آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکا۔ یہ نواب اور سردار مقتدرہ کو ترقی دشمن اور عوام دشمن نہیں لگتے۔ اس لئے نہ ان کی راہیں مسدود کی جاتی ہیں نہ انہیں پہاڑوں کی اور دھکیلا جاتا

ہے۔ بلکہ پاکستان کی نمائندہ سیاسی جماعتیں بھی انہیں اپنے سایہ عاطفت میں لینے کو بے قرار رہتی ہیں۔ وہ جو بلوچوں کے دکھ درد کا مداوا کرنے کے دعویدار ہیں' انہوں نے ہی چن چن کر ان نوابوں' سرداروں' وڈیروں اور جاگیرداروں کو اپنے حلقہ احباب میں جمع کر لیا ہے۔ یہی سردار' وڈیرے اور جاگیردار باقی ماندہ مولویوں کے ساتھ مل کر آئندہ حکومت بنائیں گے۔ اپنی جان بچانے کیلئے اقتدار کی چھتری تلے آنے والے قوم پرست بھی اس لولی لنگڑی عوام دشمن پارلیمنٹ کا حصہ ہوں گے۔ اس لئے یہ طے ہے کہ بلوچستان میں نہ صرف موجودہ انتخابات بلکہ موجودہ نظام کے ہوتے ہوئے دور دور تک کسی سیاسی اپ سیٹ کا کوئی امکان نہیں ہے۔ چند ایک نشستوں کی ہیر پھیر کے سوا وہی چہرے جو کبھی (ق) لیگ کے نام پر اسمبلی میں تھے' کبھی پیپلز پارٹی کی چادر اوڑھے ہوئے تھے' اب کسی اور لیگ کا چولا پہنے بلوچستان کے محکوم عوام کا مذاق اڑانے کے لئے پھر سے طاقت کے ایوانوں میں ہوں گے۔

بلوچستان کے نگران وزیراعلیٰ نواب غوث بخش باروزئی نے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے فوری بعد سب سے پہلا یہ کام کیا کہ سردار اختر مینگل کے ساتھ ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور انھیں دعوت دی کہ جب وہ وطن واپس آئیں گے تو ان سے بھی مل لیں۔ اخباری اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سردار مینگل ان سے ملنے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ بلوچستان کی سیاست میں قوم پرستوں کے لئے کسی بھی اعلیٰ حکومتی رہنما سے یہ کہہ کر ملنا آسان ہوتا ہے کہ ہم سیاسی نہیں بلکہ قبائلی حوالے سے ملے تھے اور ہماری ملاقات میں کوئی سیاسی بات زیر بحث نہیں رہی۔ اس طرح کی ملاقاتیں ماضی میں گورنر مگسی اور گزین مری اور خان قلات کے درمیان ہوتی رہی ہیں اور کچھ عرصہ پہلے بی این پی کے سرپرست اعلیٰ سردار عطاءاللہ مینگل اور بلوچستان کے سابق وزیراعلیٰ مرحوم جام محمد یوسف کے مابین کراچی میں ہوئی تھی۔ لیکن ایسے ملاقاتوں پر بہت جلدی ہی اخباری وضاحتیں آجاتی ہیں کہ یہ ملاقات قبائلی و خاندانی سطح پر ہوئی تھی نا کہ سیاسی و انتظامی حوالے سے۔ ہم ان ملاقاتوں میں کوئی نقص نہیں دیکھتے کیوں کہ سیاست میں ملاقاتیں اور مذاکرات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ ملاقاتیں ہونی بھی چاہئیں تاکہ تمام فریقین ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں لیکن اگر ان ملاقاتوں کو خفیہ رکھا جائے تو پھر ان پر تنقید کرنا جائز ہوگا۔ نیز ان ملاقاتوں پر اس بنا پر اعتراض کیا جاسکتا ہے اگر ان کی تردید کی جائے یا بلوچ قوم اور پارٹی ورکرز کو لاعلم رکھا جائے۔ جب رہنما ملتے ہیں تو لوگوں کو پتہ ہونا چاہیئے کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں کیوں کہ یہ ان لوگوں کا بنیادی حق بنتا ہے اور یہ عام لوگ نہیں بلکہ وہ کارکن ہیں جو اپنے رہنماؤں کی سیاست پر دل و جان سے یقین رکھتے ہیں اور ان کی سیاسی فلسفے اور وابستگی کی وجہ سے انھیں کبھی لاپتہ ہونا پڑتا ہے تو کبھی اپنی جان گنوانی پڑتی ہے۔ کسی بھی اہم سیاسی عمل سے کارکناں کو لاعلم رکھنا جرم کے مترادف ہے۔ کارکناں کو پتہ ہونا چاہیئے کہ ان کے رہنما کیا سوچ رہے ہیں اور کس سمت جارہے ہیں مشرف دور میں ملک دشمن قرار دے کر آپریشن میں مار دیئے جانے والے بلوچ بزرگ قوم پرست رہنماء نواب محمد اکبر خان بگٹی کے صاحبزادے نوابزادہ طلال اکبر، پوتے شازین بگٹی اور نواب عالی بگٹی بھی انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں جبکہ ادھر سخت مؤقف کے حوالے سے پہچانے جانے والے بزرگ قوم پرست رہنما نواب خیر بخش مری کے صاحبزادے نوابزادہ جنگیز مری نے بھی کوہلو سے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا ہے جن کے کاغذات نامزدگی جمع ہوچکے ہیں جنگیز مری کی سیاسی وابستگی پاکستان مسلم لیگ (ن) سے ہے جہاں بلوچ قوم پرست رہنماؤں کا انتخابات میں حصہ لینے کو خوش آئند قرار دیا جارہا ہے وہاں ۲۰۰۸ کے عام انتخابات کا بائیکاٹ کرنے والی پشتونخواہ ملی عوامی پارٹی کی جانب سے بھی انتخابی عمل کا حصہ بننے کو خوش آئند تصور کیا جارہا ہے جن کے بائیکاٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جمعیت علماء اسلام برسر اقتدار آئی اور پشتون علاقوں میں مذہبی انتہاء پسندانہ سوچ پروان چڑھنے لگی ہے۔ بلاشبہ بلوچ اور پشتون قوم پرستوں کے انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلوں کے بعد یہ انتخابات انتہائی اہم تصور ہورہے ہیں انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کی دھمکیاں دینے کے باوجود قوم پرستوں کے حصہ لینے کی کئی وجوہات ہیں جو زیر بحث ہیں۔

اول، ان کی سیاست پُرعزم ہے اور اس کا اظہار بلوچستان اور اس کے باشندوں سے متعلق اُن کی تشویش سے ہوتا ہے اور وہاں ان کا بڑا ووٹ بینک بھی موجود ہے۔ امید پیدا ہوتی ہے کہ ایسی اسمبلی جس میں ان جیسی شخصیات موجود ہوں

گی، وہ نااہلی اور بدعنوانی کی اس سطح تک نہیں گرے گی، جتنا کہ گذشتہ اسمبلی ثابت کرچکی۔ یا کم ازکم وہ ترقیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے اور فنڈز کے استعمال پر چیک اینڈ بیلنس تو ضرور رکھیں گے۔

دوئم، بڑی تعداد میں موجود دیگر سخت گیر جماعتوں کے مقابلے میں، یہ شاید بدستور امید کی وہ کرن ہیں جو مسلح جدوجہد کرنے والوں اور ریاست کے درمیان، موجود خلیج کو پاٹ سکتے ہیں۔مرکزی دھارے میں شامل سیاسی جماعتیں، مسلح گروہوں کے لیے توہین کے مترادف ہیں جو سمجھتے کہ یہ اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں اُن کا سودا کرچکے، ایسے میں یہ ہدف آسان نہ ہوگا۔ساتھ ہی گذشتہ برسوں کے دوران پیش آنے والے جبری گمشدگیوں اور بلوچستان کے بعض حصوں میں لاپتا افراد کی مسخ شدہ لاشیں پھینکے جانے کے واقعات بھی ہیں۔اس نے بھی صوبے کے بعض علاقوں میں عام بلوچ کے نقطہ نظر کو متاثر کیا ہے۔گذشتہ اسمبلی کے مقابلے میں، جہاں بہت سارے قبائلی سرداروں کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں سے وابستہ ایسے قانون ساز موجود تھے کہ جن کی ترجیحات میں بلوچستان کہیں نہیں دکھائی دیا لیکن اس کے مقابلے میں، ایسی اسمبلی جس میں قوم پرست جماعتیں موجود ہوں، یقینی طور پر بڑی کامیابیاں لاسکتی ہے۔اس سے مُراد یہ کہنا بھی نہیں ہے کہ قوم پرست جماعتیں انتخابات میں شامل ہوکر، بلوچ ووٹ حاصل کرکے، بلوچستان کو نہایت سادگی سے مسائل کی دلدل سے باہر نکال دیں گی۔پہلی بات یہ کہ بعض سخت گیر عناصر نے انتخابات میں گڑبڑ کی دھمکی دی ہے اور دیگر عام امیدواروں کے مقابلے میں، قوم پرست جماعتوں کی انتخابی عمل میں شرکت اُن کے لیے بڑا ہدف بن سکتی ہے۔دوسرا یہ کہ ابھی انہیں خود کو بلوچستان کے لوگوں سے بات چیت کا اہل ثابت کرنا ہے یا سخت گیر گروہوں سے موثر مذاکرات کرنا ہوں گے۔اس سے قبل کہ بطور سیاسی جماعتیں انہیں سنجیدگی سے لیا جائے، انہیں خود کو حکومت کرنے کا اہل بھی ثابت کرنا پڑے گا لیکن وہ اسمبلی جن میں یہ موجود نہ ہوں، ایسے میں پھر اس بات کا امکان کم ہی رہ جاتا ہے کہ بلوچستان کے تحفظات کو زیادہ سنجیدگی سے اٹھایا جائے گا لیکن الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب سے بلوچستان کے ۱۳اضلاع کو حساس اور انتہائی حساس قرار دیا گیا ہے نگران حکومت اور الیکشن کمیشن نہ صرف انتخابات کے منصافانہ، صاف شفاف اور پر امن انعقاد کے لئے پرامید اور پرعزم نظر آرہے ہیں بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ضرورت محسوس کی گئی تو حساس علاقوں میں فوج تعینات کی جائے گی لیکن انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے والوں کے عزائم کو کسی صورت کامیاب ہونے نہیں دیا جائے گا نگران حکومت اور الیکشن کمیشن کا عزم اپنی جگہ لیکن اس کے باوجود شورش زدہ بلوچستان میں پر امن انتخابات کا انعقاد اپنی جگہ سوالیہ نشان ہے کیونکہ ۱۲مارچ کو صوبائی دارالحکومت کوئٹہ میں علیحدگی پسند مسلح تنظیم بلوچ لبریشن آرمی کی جانب سے ضلعی الیکشن کمشنر کو ہدف بنا کر قتل کیا گیا، وہیں 4اپریل کو خاران میں الیکشن کمیشن کے دفتر پر دستی بم سے حملہ کیا گیا جس میں ایک پولیس اہلکار زخمی ہوا اس سے قبل آواران میں ریٹرننگ آفیسر کے دفتر پر راکٹ فائر کئے گئے خاران میں نہ صرف الیکشن کمیشن کے دفتر پر حملہ کیا گیا بلکہ نادرا کے دفتر پر بھی حملہ کیا گیا مکران میں بلوچ قوم پرستوں سمیت متعدد امیدواروں کو دھمکیاں بھی دی گئی ہیں مسلسل دس سال تک اقتدار میں رہنے والی قوم پرست جماعت بلوچستان نیشنل پارٹی (عوامی) کے سربراہ میر اسراراللہ زہری نے الیکشن کمیشن کو ایک خط بھی ارسال کیا کہ قلات ڈویژن سمیت متعدد علاقوں میں بعض جماعتوں کی جانب سے نہ صرف ان کے امیدواروں کو دھمکیاں دی جارہی ہیں بلکہ ووٹرز کو بھی ڈرایا اور دھمکایا جارہا کہ اگر انہوں نے بی این پی عوامی کے امیدواروں کے حق میں ووٹ کا استعمال کیا تو انہیں انکے بچوں سمیت قتل کرکے الزام ریاست دشمن بی ایل اے کے سرتھونپ دیا جائے گا اس پوری صورتحال کے بعد بلوچستان میں پر امن اور سازگار ماحول میں انتخابات کا انعقاد اور اس کے بعد آنے والے حکومتی سیٹ اپ کا منظرنامہ مکمل طور پر واضح دکھائی نہیں دیتا اس حوالے سے کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا۔

یہ مضمون خصوصی طور پر فردمیگزین کے لئے لکھا گیا ہے جس کے لئے ہم مصنف کے شکرگزار ہیں۔

مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

لبرل نقطہ نظر

ہمارا آئین ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم ملکی باگ دوڑ سمبھالنے کیلئے اپنے نمائندوں کو منتخب کریں۔ آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عوام اگر اپنے نمائندوں کے کام سے مطمئن نا ہوں تو وہ انہیں اقتدار سے ہٹانے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ انتخابات کے ذریعے عوام اپنے نمائندوں کو پارلیمنٹ میں بیٹھنے کی اجازت دیتی ہے جو ان کی بھلائی کیلئے کام کرتے ہیں۔ اس طرح ہر انتخاب میں عوام ملک کے مینیجران کا انتخاب کرتی ہے۔ اسطرح انتخابات کے ذریعے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ طاقت کا سرچشمہ اصل میں عوام ہے نا کہ ان کے چنے ہوئے نمائندے کیونکہ انہیں عوام نے چنا ہے۔

فرد میگزین کے اس شمارے کا موضوع انتخابات ہے۔ اس شمارے میں بیان کردہ مضامین انتخابی عمل کو شفاف اور منصفانہ انداز میں منعقد کروانے پر روشنی ڈالنے کی کوشش ہیں۔ مثلاً ایک مضمون انتخابات کو پیسے کے زور پر جیتنے اور پارٹی فنڈز کے بے دریغ استعمال پر روشنی ڈال رہا ہے جبکہ ایک مضمون جس کا عنوان 'ان میں سے کوئی نہیں' ہے بہت سے ملکوں میں بیلٹ پیپر پر موجود 'ان میں کوئی نہیں' کے آپشن پر بحث کی کوشش ہے۔ باقی مضامین انتخابات میں فوج، الیکشن کمیشن اور کلعدم جماعتوں کے کردار پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

ان مضامین کا مقصد ہرگز سیاستدانوں پر تنقید کرنا نہیں ہے۔ اس کے برعکس فرد میگزین کا یہ شمارہ ان سیاستدانوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہے جنہوں نے پچھلے پانچ سالوں میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ افراتفری اور پرتشدد حالات کے باوجود یہ سیاستدان متحد رہے اور جمہوریت کی مضبوطی کی خاطر قربانیاں دیں اور کلعدم تنظیموں کی دھمکیوں اور اپنی جانوں کی پرواہ کیے بغیر اس ملک کی عوام کے لئے سرگرم عمل رہے۔

ایک سیاسی کارکن سے گفتگو

سندس سیدہ

ایک سیاسی کارکن کہیں تو اپنے خاندان کی پیروی کرتے ہوئے سیاست کی راہ پر چلنا شروع کر دیتا ہے اور کہیں سیاست میں حصہ لینے کے لیے اس راہ کو منزل تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ دنیا بھر میں قیادت نچلی سطح سے ہی ابھرتی ہے اور انہی سہاروں پر پل کر جوان ہوتی ہے، مگر کیا ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟

کسی بھی جماعت میں سیاسی کارکنوں کی کمی نہیں ہوتی۔ سیاسی کارکن میڈیا کی نظروں سے تو دور ہوتے ہیں مگر سیاست دانوں کے لیے کارآمد مہروں کا کام دیتے ہیں۔ یہاں ایسے ہی ایک نوجوان سیاسی کارکن کا ذکر کیا جا رہا ہے جس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے خاندان والوں کو سیاسی جماعتوں کے لیے کام کرتے دیکھا اور نوعمری میں ہی سیاست کا حصہ بن گیا۔ اس نے دس سال ایک ہی جماعت کے لیے نہ صرف خود کام کیا بلکہ لوگوں کو بھی اپنی جماعت کی طرف راغب کیا۔ عدنان کے خیال میں اس نے اس جماعت کے لیے اس لیے کام نہیں کیا کہ اس کے خاندان والے اس جماعت کے ساتھ ہیں، بلکہ اس نے انصاف پسند اور لوگوں کے لیے کام کرنے والے لیڈر کا انتخاب کیا تھا لیکن اب نہ تو وہ جماعت رہی اور نہ ہی وہ سیاستدان، اسی لئے عدنان نے وہ پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔

لیکن میرے خیال میں ایک انصاف پسند لیڈر کا انتخاب عدنان کے لیے اس لیے آسان نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے خاندان والوں کی دکھائی ہوئی راہ پر چل رہا تھا۔ ۱۵ سالہ نوجوان جس نے اپنے خاندان والوں کی پیروی میں سیاست اور سیاست دانوں کو جانے بغیر ایک کارکن کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا تھا، اسے اب اپنی بھولی بھالی معصوم اور نادان زندگی گزارنے کے بعد یہ آزادی حاصل ہو گئی تھی کہ وہ جس جماعت کے لیے چاہے کام کر سکتا ہے۔ شاید یہ آزادی بھی عدنان کو اسی وجہ سے ملی کہ اب اس کے خاندان والوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کا بیٹا اپنی مرضی کے مطابق جس کے ساتھ چاہے کام کر سکتا ہے۔

عدنان کا کہنا تھا کہ ''عمومی طور پر یہ سوچا جاتا ہے کہ اگر کسی سیاسی کارکن کی ایک جماعت سے نظریاتی وابستگی ہے تو وہ اسی کا کارکن رہے گا، چاہے یہ وابستگی کسی لیڈر ہی سے کیوں نہ ہو؟ عدنان نے بتایا کہ کچھ دن پہلے اس نے ایک جلسے میں دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص سے ایک رپورٹر نے پوچھا کہ آپ کس کو ووٹ دیں گے؟ انہوں نے کہا کہ بھٹو صاحب کو دیتے ہیں اور انہی کو دیں گے۔ کسی ایک فرد کی بجائے کسی سیاسی پارٹی یا کسی منشور کا ساتھ دیں یہ ہی وہ سوچ ہے جو ہماری نسل نے قائم کرنی ہے۔'' عدنان کے خیال میں اگر ہماری سوچ اور ہمارا انتخاب آزاد نہیں ہوگا تو ہم خود جمہوریت کے لیے ایک خطرہ بن جائیں گے۔

عدنان کے خیال میں وہ اندھی تقلید کرنے والا جیالا یا سیاسی کارکن نہیں ہے۔ ان کے لیے لیڈر کی بجائے جماعت کا منشور زیادہ اہم ہے۔ ان کے خیال میں جب حالات ایسے ہو جائیں کہ سیاسی کارکنوں کو بیساکھی بنا کر ابھرنے والے لیڈر پلٹ کر خبر بھی نہ لیں تو ایسے میں باشعور، تعلیم یافتہ اور ملک و قوم سے مخلص انسان کبھی بھی ایسے لیڈروں کا ساتھ نہیں دے گا۔

کاش یہ آزادی ہر سیاسی کارکن کو حاصل ہو جائے۔ لیکن کچھ علاقوں میں اب تک لوگ اندھی تقلید اور ناخداؤں کو پوجتے چلے آ رہے ہیں۔ آج کے دور میں بھی

ہماری سوچ اتنی آزاد نہیں ہوئی کہ ہم اپنا حق رائے دہی استعمال کرتے ہوئے اپنے اور وطن کے مفاد کے لیے ووٹ دیں۔عدنان اندھی تقلید کرنے والے کارکن تو نہیں لیکن انہوں نے بھی سیاسی کارکن بننے کے لیے اسی پارٹی کا انتخاب کیا تھا جس کو اس کے خاندان والوں نے اپنا پیر مانا تھا۔

روٹی، کپڑا، مکان کا نعرہ لگانے والے اگر یہ واضح کر دیں کہ یہ سب دینے کا نعرہ ہے یا جو کچھ عوام کے پاس ہے وہ بھی کے لینے کا تو میرے لیے یہ جاننا آسان ہو جائے گا کہ میں ووٹ کس منشور کے لیے دے رہی ہوں۔مگر یہ نعرے جلوسوں کی ہی زینت بن کر رہ جاتے ہیں اور عام عوام ان ہی تمام چیزوں سے محروم رہ جاتی ہے۔کیا ایک لیڈر جو ہمارے ہی ووٹوں سے منتخب ہو کر سیاست کے تخت پر بیٹھتا ہے وہ ہمیں یہ سب دے سکتا ہے؟ کیا یہ نعرے لگا کر ہماری سوچ محدود نہیں کر دی گئی؟ یہ ہی وہ بنیادی ضروریات ہیں جو ہم اپنی محنت کی بجائے سیاسی لیڈروں سے لینا چاہتے ہیں اور بعد میں ہم اپنا محاصرہ نہیں کرتے کہ یہ ہی سب تو ہم نے بھی ان سے چاہا تھا۔

سیاسی کارکن کے کلچر سے جمہوریت کو فائدہ ہوا ہے یا نقصان؟ اس کے جواب میں عدنان نے کہا کہ ''جمہوریت ہے ہی کہاں؟ صرف جمہوریت کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اصل جمہوریت آئے، ایسے لوگ آئیں جو صرف اپنے جیالوں کیلئے ہی نہیں بلکہ پوری عوام کے مفاد کی خاطر کام کریں۔''

سیاسی کارکن ہمیں راغب کر سکتے ہیں کہ ہم کسی جمہوری سیاسی لیڈر کا انتخاب کریں یا پھر ہم میں ہی اتنا شعور، آگہی اور تعلیم ہو کہ ہم اپنے جمہوری حق کو استعمال کرتے ہوئے اپنے لیڈر کا انتخاب کریں۔

عدنان کے لیے کسی بھی لیڈر کی حمایت کرنے کا مقصد اپنے علاقے کے لوگوں کی بنیادی اور اجتماعی ضروریات پوری کروانا ہے۔ان ۵ سالوں میں ان کو وہ لیڈر نہیں ملے نہ ہی کوئی ان کی مدد کے لئے آیا، اسی لئے عدنان نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا ہے اور اپنی جماعت چھوڑ کر کسی دوسری پارٹی کے لئے زندگی وقف کر دی ہے۔ان کے خیال میں اس جماعت میں تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو ہمارے ملک کی ضرورت ہیں۔میرے اس سوال پر کہ اگر یہ جماعت بھی آپکی امیدوں پہ پورا نہیں اتری تو؟ عدنان یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ انہیں کسی ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا۔انہیں اس جماعت سے بہت امیدیں ہیں۔میں عدنان کو یہ مشورہ دیے بغیر نہ رہ سکی کہ کسی بھی لیڈر سے اپنے مفاد کے لیے اتنی امیدیں رکھنا درست نہیں بلکہ ان کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ اگر ہمارا ہی سہارا لے کے ابھرنے والے لیڈر اگر ہمارے کام نہ آئے تو ہم اپنی طاقت کا استعمال کیسے کر سکتے ہیں۔ ہم اس لیے ووٹ دیتے ہیں کہ یہ لیڈر ہمارے کام آئیں گے اور ہمارے علاقے کے لیے کام کریں۔لیکن جب عدنان کو ۵ سالوں میں اپنے لیڈروں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو اس نے اس پارٹی کی طرف رجوع کیا جس نے اس کو امیدیں دلائیں اور جہاں سے اس کو اپنا مطلب پورا ہوتا نظر آ رہا ہے۔لیکن جمہوریت تو کچھ اور ہی ہے کہ ہمیں اندھی تقلید نہیں کرنی بلکہ جو قدم بھی اٹھانا ہے ملک کے مفاد کی خاطر اٹھانا ہے نا کہ کسی پارٹی یا شخصیت کا ساتھ دینا ہے۔لیکن ہم بھی تو اس لیے ووٹ ڈالتے ہیں کہ ہمارے علاقے کا کوئی کارکن ہمارا کام کروائے گا لیکن بعد میں ہمارا سامنہ ہونے پر پہچاننے سے بھی انکاری ہو جاتے ہیں۔

عدنان کے خیال میں ہم ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جہاں عورت کو آزاد تصور نہیں کیا جاتا، لیکن ہماری خواتین انتخابات میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔نا صرف ووٹ مانگنے کے لئے بلکہ پولنگ اسٹیشنز پر ڈیوٹی دینا اور وہاں لوگوں کو راغب کرنے میں بھی عورتیں کسی سے پیچھے نہیں رہتیں۔ہم لوگ عورت کو کامیابی کی سیڑھی تو بناتے ہیں لیکن پھر بھی انہیں اپنا حق نہیں ملتا۔یہ وہ ہی کارکن ہیں جو بے شک کچھ پانے کے لیے ہی سہی لیکن اپنے لیڈروں کی خاطر تشدد بھی برداشت کرتے ہیں۔سیاست میں ہونے والی دشمنیوں سے کوئی امیر اور اثر و رسوخ رکھنے والا کارکن تو نبرد آزما ہو سکتا ہے مگر کسی معمولی کارکن کو سب کچھ داؤ پر لگانے کے باوجود بھی کچھ نہیں ملتا۔

اگر ہمارے ذہن اتنے کشادہ ہو چکے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ جب عورتوں کے حقوق

کا کوئی بل پاس ہوتا ہے تو اس پر اتنی سوچ بچار اور تاخیر ہو جاتی ہے؟ کیا یہ ہم خواتین ہیں جو اپنا حق دیر سے پہچانتی ہیں یا ہمارے لیڈر کسی عورت کو اپنے مدِ مقابل نہیں دیکھ سکتے؟

میرے اس سوال پر کہ لوگوں کو پولنگ سٹیشن تک لے کر آنا ہی سیاسی کارکنوں کا مقصد ہے یا ان کو سہولت کے ساتھ گھر پہنچانا بھی ان کے فرائض میں شامل ہے؟ ایک مسکراہٹ کے ساتھ سچائی کا کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے عدنان نے اعتراف کیا کہ مطلب پورا ہو جانے کے بعد کون کسی کا خیال کرتا ہے۔ سیاست کی بنیاد ہی یہ ہے اور لوگ خود اتنے خودغرض ہونے کے باوجود سیاست دانوں سے امیدیں لگاتے ہیں کہ وہ ہمارے کام آئیں گے۔ مگر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم نے جو فصل بوئی ہے وہ ہی کاٹنی ہے۔

تو کیا آپ اپنے لیڈروں کے لیے انتخابات والے دن نعرے لگانے اور لوگوں کو اکٹھا کرنے کے علاوہ کوئی دھاندلی بھی کرتے ہیں؟ عدنان کا کہنا تھا کہ ''یہ تو سب کو پتہ ہی ہے کہ بعض اوقات ووٹ خریدے بھی جاتے ہیں، آخری وقت پر جب کسی نے ووٹ نہ ڈالا ہو تو سیاسی کارکن پیسے دے کر ووٹ ڈلوا لیتے ہیں یا پولنگ اسٹیشن پر جعلی لڑائی کروا کر جعلی ووٹ ڈال دیے جاتے ہیں اور یہ لوگ تو اپنے جمہوری لیڈر کا انتخاب ایسے کرتے ہیں۔ باقی لوگ اس کوشش میں لگے ہوتے ہیں کہ شفاف انتخابات کو کیسے یقینی بنایا جا سکتا ہے؟ ایک گھی کے ڈبے کے لیے جب ووٹ بکنے لگیں تو ہم حکومت کو کیسے ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ وہ ووٹ جو ہم ایک گھی کے ڈبے یا ۵۰۰ روپے کے لیے دیں گے اس کو ۵ سال بھگتنا پڑے گا۔ یقیناً ووٹ کا حق ہی وہ چیز ہے جو ہمیں آسانی سے دستیاب ہے۔

جب سیاست کی عمارت کی بنیاد ہی جعلی ووٹوں پر رکھی جائے تو ہم کس سے انصاف کی توقع رکھیں؟ کیا انصاف دلوانا لیڈر کا کام ہے؟ ایک جگہ پر عدنان انصاف پسند لوگوں کا ساتھ دینے کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف اس انصاف کو بے انصافی کی بیساکھیوں کے سہارے ابھرنا پڑتا ہے آخر ایسی صورت کیوں؟

عدنان سیاست کا حصہ ضرور ہیں مگر وہ سیاسی لیڈر نہیں بننا چاہتے۔ ان کے خیال میں سیاست دان کو باکردار، انصاف پسند ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ بھی ہونا چاہیے۔ سیاست کوئی وراثت میں ملی ہوئی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی بھاگ دوڑ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سنبھال لینی چاہیے۔ صدیوں سے چلے ہوئے کارتوس جن میں چنگاری بھی باقی نہیں رہی ہم ان سے کب تک امید لگائے رکھیں گے؟ ہمیں میڈیا نے یہ شعور تو دے دیا کہ ہمیں ایک تعلیم یافتہ لیڈر کا انتخاب کرنا ہے مگر یہ ہمارے سیاسی کارکن آج بھی وہ ہی روایتی نوجوان ہیں جو کسی نہ کسی سیاست دان کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

عوام اور الیکشن کمیشن آف پاکستان

حمزہ خان

کیا سال ۲۰۱۳ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں باقی سالوں کی طرح ہی ایک سال ہوگا یا پھر اسے ایک ایسے سال کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا جس نے ملک کی تقدیر بدل کر رکھ دی؟ کیا ہم اپنے بچوں کو سال ۲۰۱۳ کے بارے میں خوشی سے بتا پائیں گے یا یہ کسی بھی ذکر کے قابل نہیں ہوگا؟ جیسے آج لاکھوں پاکستانی بیتابی سے الیکشن کے دن کا انتظار کر رہے ہیں۔ سول سوسائٹی، میڈیا اور دیگر ادارے یہ دیکھ رہے ہیں کہ آئندہ آنے والے سال کیسے ہوں گے؟ سب نظریں الیکشن کمیشن آف پاکستان پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کی ہر پالیسی کی سخت جانچ پڑتال ہو رہی ہے اور ملک کے تمام حلقوں میں اسی موضوع پر بحث کی جا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ تجربہ کار صحافیوں اور الیکٹرانک میڈیا نے الیکشن کمیشن کے ہر اقدام پر تبصرہ کرنے کا عزم کیا ہوا ہے جس کی شائد اتنی ضرورت نہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ الیکشن کمیشن کے ہر اقدم کی جانچ پڑتال کی جائے جو موجودہ حالات میں ایک بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے؟

الیکشن کمیشن آف پاکستان ایک آئینی ادارہ ہے جس کا کام ملک میں صاف شفاف انتخابات کا انعقاد ہے۔ آئین کے آرٹیکل ۲۱۸ کے تحت الیکشن کمیشن آف پاکستان (ای سی پی) حکومت کو انتخابات کروانے اور ان کو صاف شفاف بنانے کی ہدایت کرتا ہے۔ آئین ہمیں یہ ہدایت بھی کرتا ہے کہ وفاق اور صوبوں کے تمام انتظامی حکام چیف الیکشن کمیشنر اور الیکشن کمیشن کے پابند ہیں۔ ای سی پی کے قوانین کی پابندی لازمی ہے تو کیا ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ ہم ان اقدامات کی جانچ پڑتال کریں جو ای سی پی اٹھاتا ہے؟ اگر ای سی پی یہ کہے کہ ہر شہری جو ووٹ دینے کا اہل ہے، وہ کالا سوٹ اور نیلی ٹائی پہن کر پولنگ اسٹیشن جائے تو کیا ہم بحیثیت ایک شہری آئین کے مطابق اس پر اعتراض کر سکتے ہیں؟ یقیناً ای سی پی اس لیے بنایا گیا ہے کہ الیکشن انتہائی ہموار طریقے سے ہوں اور شہریوں کو ووٹ ڈالنے میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا تو نہیں کرنا پڑے کیونکہ ایک جمہوری ریاست میں یہی سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔

انتخابات کے ایک ہموار عمل کو یقینی بنانے کے لیے الیکشن کمیشن نے پولنگ اسٹیشنوں پر فوجی اہلکاروں کو تعینات کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ سیاسی جماعتوں سے میٹنگ کے بعد اور سیکیورٹی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے الیکشن کمیشن آف پاکستان نے کراچی، فاٹا، خیبر پختونخواہ اور دیگر حساس علاقوں میں پولنگ اسٹیشنوں پر فوجی اہلکاروں کو تعینات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ۲۷ مارچ ۲۰۱۳ کو شائع ہونے والی ایکسپریس ٹریبیون کی خبر کے مطابق ای سی پی نے فوجی حکام کو الیکشن کے دن فوجی اہلکاروں کی تعیناتی کا تفصیلی سیکیورٹی پلان پیش کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں فوجی حکام نے کہا ہے کہ ای سی پی کے اس فیصلے پر کور کمانڈرز نظر ثانی کریں گے اور پھر ایک حتمی فیصلہ دیں گے۔ فوجی حکام نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ الیکشن کمیشن کی بھرپور مدد کریں گے بشرطیکہ اس کی دیگر مصروفیات متاثر نا ہوں۔

کیا فوجی حکام کا اس طرح کا بیان دینا مناسب ہے؟ کیا آئین کے آرٹیکل ۲۲۰ کے تحت فوج ای سی پی کو مدد فراہم کرنے کی پابند نہیں ہے؟ ایک حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے جائزہ لینے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ہے؟ کیا فوجی حکام آرٹیکل ۲۲۰ کی خلاف ورزی نہیں کر رہے؟ کیا فوج نے اپنی اتھارٹی کو چیک کرنے کی کوشش نہیں کی ہے؟ کیا ماضی میں انھوں نے پاکستان میں مارشل لاء نافذ کرنے

اور سیاست میں دخل اندازی کرنے سے پہلے اور مختلف سیاسی جماعتوں کو پیسے دینے سے پہلے قوائد وضوابط کو چیک کیا تھا؟

میری رائے کے مطابق فوج کو کسی صورت بھی ایسا بیان نہیں دینا چاہیے تھا۔ جب آئین میں یہ شک موجود ہے کہ تمام حکام الیکشنز میں ای سی پی کی مدد کریں گے تو فوج کے جائزہ لینے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یہ تو ایسا ہے کہ گھر کو آگ لگ جائے اور فائر بریگیڈ بیان دے کہ ہم آگ بجھانے سے پہلے صورت حال کا جائزہ لیں گے۔ یہ تو سمجھنے کی بات ہے کہ جب عمارت کو آگ لگ جائے تو سول حکام پر لازم ہے کہ وہ آگ بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کو بھیجیں۔ اسی طرح فوج بھی تمام دوسرے اداروں کی طرح آئین کے تحت ای سی پی کو مدد فراہم کرنے کی پابند ہے۔ پولنگ اسٹیشنوں پر فوج، رینجرز یا پولیس کو تعینات کرنے کا اختیار ای سی پی کے پاس ہے، جس کو بھی وہ بہتر سمجھے تعینات کردیں۔ کسی بھی ایگزیکٹو ادارے کا ای سی پی کو مدد فراہم کرنے میں ہچکچاہنا میری رائے میں آئین کی خلاف ورزی ہے اور اس کا تدارک ہونا چاہیے۔ عبوری سیٹ اپ کے دوران اعلیٰ حکام کو الیکشن کمیشن کی اطاعت کو یقینی بنانا چاہیے کیونکہ ناکامی ہمیں اگلے پانچ سال کے لیے پیچھے دھکیل دے گی۔ بہت وقت ضائع کرنے کی وجہ سے پاکستان کو ایک ریاست اور معاشرے کے طور پر دیگر ریاستوں کے مقابلے میں یہ قوائد کافی کم وقت میں سیکھنا ہوں گی۔ یہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر اس قدم کی حمایت کریں جو ملک میں جمہوریت اور قانون کی بالادستی کی سمت میں جاتا ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے ملکی ادارے جس میں پارلیمان، عدلیہ، ایگزیکٹو اور فوج شامل ہیں ان کو اپنے حدود میں رہنے کی ہدایت کریں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

ان میں سے کوئی نہیں

ذوالفقار حیدر

آجکل ہر پاکستانی مئی ۲۰۱۳ء میں ہونے والے انتخابات کی دھن میں مگن دکھائی دے رہا ہے۔ البتہ بہت سے ایسے سیاستدان جنہیں بعض اوقات منجھے ہوئے سیاستدان بھی کہا جاتا ہے ان انتخابات سے گھبرائے ہوئے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور اس گھبراہٹ کی وجہ ہی کچھ ایسی ہے۔ وہ تمام سیاستدان جنہوں نے ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جعلی تعلیمی دستاویزات جمع کروائے تھے انہیں ایسا ثابت ہونے پر نا صرف سزائیں دی جارہی ہیں بلکہ انہیں مستقبل میں انتخابات میں حصہ لینے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ یقیناً پاکستان میں ایسا ہونا ایک نئی روایت کو جنم دینے کے مترادف ہے۔ جمہوریت کا مقصد ہی عوام کی رائے کو اہمیت دینا ہے۔ نا صرف یہ بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں کو یہ یاد دلانا ہے کہ وہ ان پر حکومت کرنے کیلئے نہیں بلکہ ان کی خدمت کے لئے چنے گئے ہیں۔

بدقسمتی سے یا تو پاکستانی عوام کو جمہوریت کے نام پر بیوقوف بنایا جاتا رہا ہے یا جاگیردارانہ نظام کے تحت انہیں ہمیشہ دبایا جاتا رہا ہے۔ البتہ اب حالات بہتری کی جانب جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مشرف کے دورے حکومت میں جب سپریم کورٹ کو حکومت کے ماتحت کرنے کی کوشش کی گئی تو عوام کے ردعمل نے نا صرف اسے ایسا کرنے سے روک دیا بلکہ اس سے عدلیہ کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اسی وجہ سے ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۳ء کے دور میں ہمیں اکثر اوقات حکومت اور عدلیہ کے درمیان اختلافات بھی ابھرتے دکھائی دیے۔ یقیناً بہت سے تجزیہ کاروں نے ان اختلافات کو منفی رنگ دینے کی کوشش بھی کی مگر میری رائے میں ان اختلافات نے جمہوریت کی روایت کو مضبوط کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمارے ملک کے اہم ترین ادارے آئینی دائرہ کار کے اندر بہتر طور پر کام کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کی ایک بہترین مثال الیکشن کمیشن آف پاکستان ہے۔ اس ادارے کو بااختیار بنانے کیلئے جہاں بہت سے سیاستدانوں نے کوشش کی ہے وہیں سول سوسائٹی اداروں کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ الیکشن کمیشن کے ریٹرننگ افسران بغیر کسی دباوء کے اپنا کام کرنے میں مصروف ہیں۔

پاکستانی عوام کے ایک بڑے حصے نے ماضی میں ہونیوالے انتخابات میں حصہ نہیں لیا، بلکہ ہمیشہ جمہوری عمل پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ جمہوری اداروں کا بااختیار نا ہونا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دفعہ تقریباً ۹ کروڑ عوام مئی ۲۰۱۳ء میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لے رہی ہے اور ان میں سے تقریباً ۴ کروڑ نئے ووٹر ہیں۔ یقیناً یہ جمہوریت ہی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ اسی سلسلے میں ہونے والی ایک پیش رفت اس وقت متوقع ہوئی جب الیکشن کمیشن اور نگران حکومت نے بیلٹ پیپر پر 'ان میں سے کوئی نہیں' کے خانے کو شامل کرنے پر غور شروع کیا۔ اس خانے کی شمولیت کا مقصد ووٹر کو یہ حق دینا تھا کہ اگر وہ اپنے حلقے میں سے کسی امیدوار کو ووٹ نہیں دینا چاہے تو وہ اس خانے پر مہر لگا سکے گا۔ اور اگر پورے حلقے میں پچاس فیصد سے زائد ووٹرز اس خانے پر مہر لگائیں گے تو وہاں انتخابات دوبارہ منعقد کئے جائیں گے۔ البتہ سیاستدانوں کی گہری تنقید اور انتخابات میں کم وقت رہ جانے کے باعث الیکشن کمیشن نے مئی ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں اس خانے کو شامل کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔ اس فیصلے کے بعد یقیناً بہت سے سیاستدانوں کے سانس میں سانس آئی ہوگی۔

ایسا نہیں کہ اس خانے کی بیلٹ پیپر میں شمولیت کا فیصلہ صرف پاکستان میں کیا گیا۔ یونان میں یہ خانہ بیلٹ پیپر کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کی سٹیٹ نیواڈا، یوکرائن، اسپین اور کولمبیا میں ووٹروں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ انتخابات میں کسی بھی امیدوار کو پسند نہیں کرتے تو وہ 'ان میں سے کوئی نہیں' کے خانے پر مہر لگا کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ روس میں بھی یہ خانہ ۲۰۰۶ء تک بیلٹ پیپر کا حصہ رہا ہے۔ پولینڈ میں ۱۹۸۹ء میں ہونے والے انتخابات میں ووٹروں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی پسند کے امیدوار کے علاوہ دوسرے تمام امیدواروں کے ناموں پر کراس لگا سکتے تھے۔ اس طرح وہاں کے ووٹروں نے اس وقت کے وزیراعظم کو ہٹا کر نئے وزیراعظم کا چناؤ کیا۔ یقیناً جمہوری معاشروں میں 'ان میں کوئی نہیں' یا اس سے ملتے جلتے رجحانات پر عمل کیا جاتا رہا ہے۔

۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۳ء کے دور حکومت کو نا صرف تجزیہ کاروں بلکہ بہت سے سیاستدانوں نے بھی کمزور جمہوریت کا دور قرار دیا۔ البتہ میری رائے میں یہ دور کمزور ہی صحیح مگر جمہوریت کا دور تو تھا۔ اس دور حکومت میں جہاں بہت سے اختلافات نے جنم لیا وہیں بہت سے ایسے اقدام اٹھائے گئے جن سے جمہوریت کو مضبوطی حاصل ہوئی اور جاتے جاتے قومی اسمبلی نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر قانون ساز چاہیں تو قانون سازی کا عمل اتنا دشوار نہیں۔ پاکستان کے لئے یہ انتخابات نہایت اہم ہیں اور اس رائے کا اظہار امریکن انٹیلی جنس ادروں کی رپورٹ میں بھی کیا گیا ہے۔ پاکستان کو یقیناً بہت سے مسائل کا سامنا ہے مگر ان میں سے بہت سے مسائل کا حل بھی ان انتخابات میں پوشیدہ ہے اور پاکستانی عوام ان مسائل کا خاتمہ ان انتخابات میں بھرپور حصہ لینے سے کر سکتے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

عسکریت پسندی اور جمہوریت

سندس سیدہ

یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوری حکومت نے اپنا ۵ سالہ دورِ حکومت پورا کیا۔ آجکل انتخابات کا دور دورہ ہے اور اسی سلسلے میں بہت سے خدشات کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے۔ کوئی ان انتخابات میں خون خرابے کا خدشہ ظاہر کر رہا ہے اور کہیں انتخابات کے ملتوی ہونے کی بات کی جا رہی ہے۔ عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ ممالک نسبتاً زیادہ ترقی کرتے ہیں جہاں جمہوری نظام نافذ ہو اور آمریت کو ملک کی ترقی کے لیے خطرہ گردانا جاتا ہے۔ لیکن حال ہی میں اپنی مدت پوری کرنے والی جمہوری حکومت میں ہمارے ملک نے کتنی ترقی کی ہے یہ ایک اہم سوال ہے؟ ہمارے ملک نے جتنی بھی ترقی کی ہو لیکن شر پسند تنظیموں نے جتنی ترقی کی ہے اور دہشت گردی میں جس قدر اضافہ ہوا ہے وہ ملکی ترقی سے کہیں زیادہ ہے۔

آمریت ہو یا جمہوریت یہ سوال تو پوچھا ہی جاتا ہے کہ اس سے عام آدمی کو کیا فائدہ ہوگا؟ لیکن حقیقت کچھ یہ ہی ہے کہ اس کا فائدہ چند ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ کہیں یونیفارم میں ملبوس آمروں کے عزیز و اقارب مستفید ہوتے ہیں تو کہیں جمہوری سیاست دانوں کے صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کی حفاظت کے لیے پولیس کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ کہیں تو عام عوام کو پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں ہوتا اور کہیں یہ سیاستدان پانی بھی فرانس سے منگواتے ہیں۔ جہاں عام آدمی دہشتگردی کی نظر ہو رہا ہے اور انصاف حاصل کرنے کے لیے قانون کے دروازے کھٹکھٹا رہا ہے وہاں ہمارے یہ محافظ سیاست دانوں کے اور ان کی عزیز و اقارب کی حفاظت پر معمور رہتے ہیں۔

جمہوری نظام میں آزاد اور منصفانہ انتخابات کی بات کی جاتی ہے اور الیکشن کمیشن اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ نئی جماعتیں، نئے امیدوار اور نئے چہرے نظر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ شر پسند تنظیمیں جو پہلے بھی کبھی نہ کبھی خبروں کا حصہ بنتی رہتی تھیں اب کھلے عام مئی کے انتخابات میں حصہ لینے کیلئے سرگرم نظر آ رہی ہیں۔ ہمارے اس جمہوری نظام نے ان تمام شر پسند تنظیموں کو بھی جمہوری آزادی دے دی ہے جو ہمارے ملک کے لیے خطرے سے کم نہیں۔

وہ شر پسند اور فرقہ پرست تنظیمیں جن کو پرویز مشرف نے ۲۰۰۲ء میں کلعدم قرار دے دیا تھا اب بھی اپنی سرگرمیاں پوری طرح جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسکے علاوہ ان کے ممبران اور لیڈر سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں اور لے رہے ہیں۔ جب میں نے یہ اعلان سنا کہ جماعت الدعوہ کے لیڈر حافظ سعید جن پر ایک شر پسند تنظیم کے لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ ممبئی حملوں ۲۰۰۸ء میں ملوث ہونے کا الزام بھی تھا، وہ بھی الیکشن لڑ رہے ہیں تو میں اس سوچ میں پڑ گئی کہ ہمارا ملک آخر کس جانب جا رہا ہے؟

جہاں ہر امیدوار کا آرٹیکل ۶۲، ۶۳ کے مطابق احتساب کیا جا رہا ہے اور ان کے کاغذات نامزدگی مسترد کیے جا رہے ہیں وہیں کیا ایک جہادی جماعت کے لیڈر پر آرٹیکل ۶۲، ۶۳ کا اطلاق ممکن ہے؟ اگر قرآنی سورتیں سنا کر ایک شخص کی جان بخشی ہو رہی ہے تو پھر تو کوئی شک نہیں کہ اگلے انتخابات میں ایسے ہی لوگ

کھڑے نظر آئیں گے۔ اگر ہمارے ملک کی بھاگ دوڑ ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی تو کیا ہوگا؟ کیا کسی ایسے شخص کا عملی سیاست میں حصہ لینا ہمارے ملک کے لیے سودمند ہے؟ اس وقت سب سے اہم چیز ملک کا ایک مثبت امیج بنانا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر ترقی کرنا ہے۔ ہمارے مستقبل کے لیڈروں کی ترجیحات کچھ ایسی ہونی چاہییں۔ لیکن جب ہمارے سیاست دان کسی شر پسند تنظیم کے لیڈر ہوں گے تو یہ سب ممکن نہیں ہوگا اور ملک اقتصادی ترقی سے محروم رہ جائے گا۔

یہ صرف ایک پارٹی کے لیڈر کی بات نہیں ہے بلکہ وہ تمام شر پسند تنظیمیں جن کو پرویز مشرف نے ۲۰۰۲ء میں کلعدم قرار دیا تھا، ہمارے جمہوری لیڈروں کو ان کے ممبران کی مدد کی بھی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ جب ہماری بات سپاہِ صحابہ کے ایک ممبر سے ہوئی تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ مسلک کی بنیاد پہ سیاسی پارٹیوں کو سپورٹ کرتے ہیں۔ نامور سیاسی لیڈران کے پاس آتے ہیں، اور یہ لوگ ان لیڈروں کے لیے جلسے جلوس بھی منعقد کرواتے ہیں۔ لیکن وہ اس بات پر کچھ ناراض تھے کہ انہی لیڈروں میں سے کچھ لوگ اپنا مطلب پورا ہو جانے کے بعد پارلیمنٹ میں جا کر انکار کر دیتے ہیں کہ ان کا ہماری جماعت سے کوئی تعلق ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ ان کے لیڈر مولانا اعظم طارق عملی سیاست میں تھے اور ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں ان کی جماعت کے اور ممبران بھی حصہ لیں گے۔ انہوں نے "متحدہ دینی محاذ" کے نام سے ایک پلیٹ فارم بنایا ہے جس میں نامور سیاسی اور اسلامی جماعتوں کے لوگ شامل ہیں۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ وہ جھنگ کی سیٹ سے باضابطہ طور پر الیکشن میں حصہ لیتے ہیں کیونکہ ان کے لیڈر وہاں سے الیکشن لڑتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ ایسی پالیسیاں بھی بناتے ہیں کہ وہ کس جماعت کی حمایت کریں یا کسی کی مخالفت کریں، اور مخالفت اور توڑ جوڑ میں کام آنا ان کی ضرورت ہے۔ مزید، ان کو فلاحی کاموں اور دیگر کاموں کے لئے سیاسی لیڈروں کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے وقت کے حکمران کے ساتھ تعلقات اچھے رکھتے ہیں۔

یہ بات صرف شر پسند تنظیم کے ممبران سے معلومات لینے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہم آئے دن یہ خبریں دیکھتے رہتے ہیں کہ سپاہِ صحابہ کے ممبران پاکستان کی ایک اہم سیاسی پارٹی کو اور خاص طور پر جنوبی پنجاب میں اس پارٹی کے ممبران کو الیکشن میں سپورٹ کرتی ہے۔ خاص طور پر مسلم لیگ نواز کے سربراہان شر پسند تنظیموں کی سیاسی پارٹیوں کے جلسوں میں نظر آتے رہتے ہیں۔ پنجاب کے لاء منسٹر رانا ثناء اللہ کی اہل سنت والجماعت اور لشکر جھنگوی کے سربراہان مولانا احمد لودھیانوی، ڈاکٹر خادم حسین، اور ملک اسحاق کی ملاقاتوں اور ان کے روابط کی خبریں اکثر اخبار کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ وہ سیاسی سربراہان جن کے روابط اور جن کی پارٹیوں کے روابط شر پسند تنظیموں سے ہیں وہ بھی ہمارے ملک کے لیے اتنا ہی بڑا خطرہ ہیں جتنا کہ شر پسند تنظیموں کے سربراہان۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ شر پسند تنظیمیں جن کا منشور ہی جمہوری سیاسی جماعتوں سے مختلف ہے وہ کس طرح ان سے الحاق کر سکتی ہیں؟

اسلامی سیاسی تنظیموں کی بات ہو تو ان تنظیموں کے مسلک کی بنیاد پر مختلف پارٹیوں سے روابط کی خبریں بھی آجکل گردش کرتی میں نظر آتی ہیں اور کہیں ان شر پسند تنظیموں کی اپنی سیاسی پارٹیاں جنم لیتی نظر آتی ہیں۔ شاید یہ ان کی ضرورت بھی بن چکی ہے کیونکہ جب شر پسند تنظیمیں عشر لیتی ہیں اور جہاد کی بات کرتی ہیں تو ان کے لیے مشکل ہوتا ہے مگر سیاست میں آنے سے یقیناً انہیں بھی آسانی ہو جائے گی۔ جماعۃ الدعوہ کے لیڈر حافظ سعید جہادی تنظیم لشکرِ طیبہ کے بھی بانی ہیں اور وہ امریکہ اور انڈیا کے خلاف کاروائیوں کا برملا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ دفاعِ پاکستان کونسل کے جھنڈے تلے جو جہادی نعرے بلند ہوتے ہیں ان کی گونج بھی پاکستان کی فضاء میں کہیں کہیں سنائی دیتی رہتی ہے۔
ایکشن کے ساتھ ساتھ حزب التحریر کی سیاسی سرگرمیوں کی طرف نظر دوڑائیں تو ان کے راولپنڈی میں گھر گھر پھینکے گئے پمفلٹ بھی بھلائے نہیں جا سکتے جن میں موجودہ حکومت کو صاف الفاظ میں برا بھلا اور پاکستان کے لیے خطرہ قرار دیا گیا ہے۔ جہاں وہ خلافت کے قیام کے خواہاں ہیں وہاں ہی وہ امریکہ اور امریکہ سے حکومت کے روابط کو ملک سے غداری گردانتے ہیں۔

اب حالات یہ ہیں کہ پرامن انتخابات کے لیے شر پسند اور قرقہ پرست تنظیموں کے مطالبات ماننے کے لیے ہماری حکومت کو ان سے ہاتھ ملانا پڑ رہے ہیں۔انتخابات سے پہلے ہی سکیورٹی کی صورتحال کچھ ایسی ہے کہ ہمارے جیسے مڈل کلاس لوگوں کو ووٹ ڈالنے سے ہمارے والدین منع کر رہے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ باقی صوبوں میں سندھ جیسی صورتحال نہیں ہوگی جہاں پر ووٹ بھی اکثر اوقات گن پوائنٹ پر ڈلوائے جاتے ہیں۔

اس ملک میں جہاں ملالہ جیسی بچی سے لے کے بےنظیر بھٹو جیسی خاتون سیاست دان بھی دہشتگردی سے محفوظ نہ رہ سکیں وہاں آج تک دہشتگردی کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوسکی اور اب ہم خود ایسے لوگوں کو عملی سیاست میں آنے کی اجازت دے رہے ہیں جو خود دہشتگردی میں ملوث پائے جاتے رہے ہیں۔یقیناً یہ سوچ طلب بات ہے۔پاکستان میں ۲۰۰۲ میں بہت سی شر پسند جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور چند سال قبل حزب التحریر جیسی جماعت کو بھی بین کر دیا گیا تھا حالانکہ آج تک برطانیہ بھی ایسا کرنے میں ناکام رہا ہے اور اس کی واحد وجہ جمہوریت اور قانون کا احترام اور اظہار رائے کی آزادی ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ پاکستانی عوام بھی ملک کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا ووٹ کا استعمال کرے گی ان شر پسند تنظیموں کو سیاست سے باہر نکال پھینکے گی تاکہ یہ بات ہمیشہ کے لئے واضح ہو جائے کہ بیشک پاکستان میں شر پسند تنظیموں کو انتخابات میں کھڑے ہونے کی اجازت ہے مگر عوام نے انہیں نا منظور قرار دے دیا ہے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

جو عوام چاہے گی

حمزہ خان

رہنما اپنی عوام کی خواہشات کا کس طرح تعین کرتے ہیں؟ اقتدار میں جو پالیسیاں بنائی جاتی ہیں ان کے تحت لوگوں کی ضروریات کی عکاسی کس طرح کی جاتی ہیں؟ جمہوریت ان سوالات کے جوابات فراہم کرتی ہے۔ جمہوریت کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ رہنما ان پالیسیوں کو متعارف کرواتے ہیں جو لوگوں کی خواہشات پر مبنی ہوں۔ سروے اور سوال نامے شہریوں کی آراء جاننے کے لیے اہم آلہ کار سمجھے جاتے ہیں۔

انتخابات کے قریب ہونے کی وجہ سے آج کل پاکستان میں سروے اور تحقیق کا دور دورہ ہے۔ انتخابات کے بارے میں عوام کی رائے جاننے کے لیے مختلف ادارے اور میڈیا گروپس مسلسل سرویز منعقد کر رہے ہیں۔ ہیرلڈ رسالے کے فروری شمارے کو کچھ حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ہیرلڈ نے کے ادارتی بورڈ نے پاکستان میں کچھ اداروں کی مدد سے ملکی حالات کے بارے میں سروے منعقد کیا، جس میں تعلیم، غیر سرکاری تنظیموں اور محققین سے سروے کے متعلق مشوارت کی گئی۔ کل ۱۵۰ سوال پوچھے گئے اور پاکستان کی کل آبادی کی نمائندگی ۱۳۰۰ افراد کے نمونے نے کی۔ یہ رسالہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس سروے کو شہریوں کی خواہشات کی بہترین نمائندگی نہ سمجھی جائے، کیونکہ ۱۳۰۰ شہری ۱۸ کروڑ پاکستانیوں کی آراء کی عکاسی نہیں کر سکتے۔

میں جیسے جیسے سروے کے نتائج کو پلٹ رہا ہوں، میرے ذہن میں ایک سوال گردش کرنے لگا ہے کہ جو پاکستان کی نمائندگی کرنا چاہتے ہیں، کیا وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ موجودہ پاکستان کس طرح سوچ رہا ہے؟

شہریوں سے سوال پوچھا گیا کہ کس قسم کی غیر ملکی امداد پاکستان کے لیے فائدے مند ہے؟ اس کے جواب میں ۶۱ فیصد شرکاء نے ڈولپمنٹ امداد کا کہا اور ۶ فیصد نے فوجی امداد کا کہا۔ تو کیا سیاسی جماعتیں اس بات پر غور کریں گی، جن پر خارجہ پالیسی بنانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ مزید، نمائندہ نمونے کے ۷۲ فیصد کا کہنا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں آبادیوں کو برابر کا حق دیا جانا چاہیے۔

یہ سروے مختلف موضوعات کو چھوتے ہوئے انتخابی عمل، کرپشن، فوجی سول تعلقات، نئے صوبوں کے قیام اور میڈیا کے بارے میں سوال پوچھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں شہریوں سے ممنوعہ اشیاء اور مختلف مسائل پر آراء حاصل کی گئی ہیں۔

نصف سے زائد آبادی کا کہنا تھا کہ انتخابی نتائج امیدوار کی پیسہ خرچ کرنے کی صلاحیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ یقیناً عوام اقتدار میں آنے والے رہنماوں کی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کرپشن اور وسائل کے استحصال کی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اس حقیقت کو قبول کیا گیا ہے کہ امیدوار کی کامیابی انتخابات میں پیسے خرچ کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اصل میں یہ بات اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ عوام اب اپنے حکمرانوں کا احتساب چاہتی ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ انتخابی مہم میں کون سے وسائل استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح ۳۸ فیصد شرکاء امریکہ کے ساتھ غیر جانبدار تعلقات چاہتے ہیں۔ اس سے یوں لگتا ہے کے عوام پاکستان اور امریکہ کے درمیان عجیب و

غریب پالیسیوں سے تنگ آ چکی ہے۔ وہ اب غیر جانب دارنہ تعلقات چاہتے ہیں جو دونوں ممالک کو برابری پر رکھیں اور ایک دوسرے کے درمیان مصلحت پر مبنی اور خوشگوار تعلقات قائم ہوں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ عوام کی سوچ تبدیل ہو رہی ہے، جو کہ دنیا میں پاکستان کی تصویر کی ازسرنو تعمیر میں مدد کرے گی۔

جب شرکاء سے سوال کیا گیا کے پاکستان کی معیشت کو بہتر بنانے میں کن مسائل کا سامنا ہے؟ تو مختلف جوابات سامنے آئے۔ ۱۷ فیصد نے اتفاق کیا کہ سب سے بڑی وجہ نااہل رہنما ہیں۔ ۱۶ فیصد نے کہا ناقص حکمرانی، جبکہ ۱۹ فیصد نے کہا پاکستان کی معیشت میں سب سے بڑی رکاوٹ کرپشن ہے۔ جب دیہی اور شہری آبادیوں کے جوابات کا موازنہ کیا گیا تو دونوں دھڑوں کے جوابات تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ شہریوں اور دیہاتیوں کی سوچ میں بڑا فرق ہونے کے باوجود یہ دونوں اوپر بیان کردہ تینوں مسائل پر اتفاق ظاہر کرتے ہیں، جن سے پاکستان کی معیشت متاثر ہو رہی ہے۔ ۱۸ فیصد شہری اور ۱۷ فیصد دیہی آبادی نے نااہل حکمرانوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ۱۶ فیصد شہری آبادی جبکہ ۱۹ فیصد دیہی آبادی کا جواب ناقص حکمرانی تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس پر شہری اور دیہاتی ایک سا سوچتے ہیں۔ اسی طرح جب سوال کیا گیا کہ پاکستان کو کن شعبوں میں زیادہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے تو شہری اور دیہی آبادیوں کے جوابات میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ صحت کے شعبے کی بہتری کیلئے ۱۰ فیصد شہری اور دیہاتی عوام نے اپنی رائے کا اظہار کیا، تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے ۱۱ فیصد شہری اور ۱۲ فیصد دیہی آبادی نے، جبکہ بنیادی ڈھانچے کی بہتری کیلئے ۷ فیصد دیہی اور ۸ فیصد شہری عوام نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

جب یہ پوچھا گیا کہ پاکستان کا سب سے بدعنوان ادارہ کون سا ہے تو ۲۸ فیصد کیا خیال تھا پولیس، ۲۵ فیصد کا خیال تھا سیاستدان، ۸ فیصد کا خیال تھا انکم ٹیکس کا ادارہ، ۷ فیصد کا ریونیو ڈیپارٹمنٹ اور ۶ نے میڈیا کو بدعنوان کہا۔

نئے صوبوں کے مسائل سے متعلق چونکا دینے والے نتائج سامنے آئے۔ جب شرکاء سے یہ پوچھا گیا کہ کیا وہ نئے صوبے کے قیام کے حق میں ہیں؟ تو ۳۶ فیصد نے نئے صوبے کے قیام کے حق میں جبکہ ۳۸ فیصد نے اس کے قیام کے خلاف جواب دیا۔ نئے صوبوں کے قیام کا معاملہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے، اس مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت ہے بجائے اس کے کہ یہ معاملہ لسانی اور نسلی فسادات کا رخ اختیار کرے۔

شدت پسندی کے مسئلے سے متعلق ایک سوال کے جواب میں عوام کی ایک واضح اکثریت یا ۷۲ فیصد کا خیال تھا کہ شدت پسندی پاکستان کا سنگین ترین مسئلہ ہے۔ شرکاء کی اس رائے پر پالیسی بنانے والوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور ایسی پالیسیاں مرتب کرنی چاہییں جن سے شدت پسندی کی لعنت کا جڑ سے خاتمہ کیا جا سکے۔ اسی طرح کے ایک اور سوال پر کہ طالبان کے خلاف حکومت کو کیا موقف اختیار کرنا چاہیے تو ۳۶ فیصد کے خیال میں اس معاملے کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنا چاہیے جبکہ ۳۹ فیصد کے خیال میں مذاکرات کے ساتھ ساتھ فوجی کاروائی طالبان کے خلاف ایک مناسب اقدام ثابت ہوگی۔

پاکستان میں تشدد کے فروغ میں کونسا گروپ اہم ہے؟ اس سوال کے جواب میں ۳۰ فیصد کیا خیال تھا طالبان، ۲۹ فیصد کے خیال میں فرقہ وارانہ گروہ، ۱۶ فیصد کے خیال میں سیاسی جماعتیں جبکہ ۱۴ فیصد نے مذہبی جماعتوں کو اس کا ذمہ دار ٹھرایا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مذہبی جماعتوں اور فرقہ وارانہ گروہوں کی پشت پناہی طالبان ہی کرتے ہیں جبکہ طالبان کو لوگوں نے دوسروں سے الگ کر دیا ہے۔ شدت پسندی کے تمام عناصر جو طالبان، فرقہ وارانہ گروہ اور نسلی گروہ ہیں ان کا حل تلاش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

گزشتہ چند دہائیوں سے ہر سال دنیا بھر میں خواتین کے مسائل (خواتین کو بااختیار بنانے اور امتیازی صنفی سلوک سے متعلق مسائل وغیرہ) کے بارے خبریں ابھر کر سامنے آتی رہیں ہیں۔ اسی مناسبت سے اس نازک موضوع پر اس سروے میں بھی سوالات اٹھائے گئے۔ اس سروے میں خواتین کے انتخابات لڑنے، تعلیم حاصل کرنے اور اپنا پسندیدہ پیشہ چننے کے حقوق سے متعلق سوالات پوچھے گئے۔

جب یہ پوچھا گیا کہ حکومت کی خواتین سے متعلق کیا پالیسی ہونی چاہیے؟ تو ۶۶ فیصد کے خیال میں خواتین کو انتخابات لڑنے کی آزادی ہونی چاہیے جبکہ ۱۹ فیصد کے خیال میں ان کے انتخابات لڑنے پر پابندی عائد کر دینی چاہیے، ۱۵ فیصد کا خیال تھا کہ حکومت کو اس پر غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ اس سوال پر کہ خواتین کو مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے حوالے سے حکومت کی کیا پالیسی ہونی چاہیے؟ تو ۴۸ فیصد نے کہا کہ حکومت کو اس کو فروغ دینا چاہیے، جبکہ ۲۸ فیصد اس سے متفق نہیں تھے، ان کے خیال میں حکومت کو اس پر پابندی عائد کر دینی چاہیے۔ مزید برآں جب یہ پوچھا گیا کہ مردوں یا عورتوں میں سے کس کی تعلیم پر ترجیح دینی چاہیے؟ تو ۶ فیصد نے لڑکیوں کی حوصلہ افضائی کی جبکہ ۵ فیصد نے لڑکوں کی اور ۸۸ فیصد نے دونوں کی برابری کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ پاکستان میں کڑی ثقافتی رسومات کی وجہ سے خواتین کو زبردستی شادی پر مجبور کیا جاتا ہے، چاہے وہ خوش ہوں یا نہ ہوں وہ اپنی مرضی سے شادی ختم نہیں کرسکتیں۔ اسی وجہ سے شہریوں کی رائے جاننے کے لیے یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا خواتین کو طلاق کا حق ہونا چاہیے؟ تو ۴۰ فیصد کے خیال تھا کہ ہونا چاہیے جبکہ ۳۹ فیصد کے خیال میں نہیں ہونا چاہیے۔ خواتین کے حقوق سے متعلق سوالات پر ہماری قوم ایک الجھاو کا شکار نظر آتی ہے، جیسا کہ کچھ لوگ خواتین کے حق میں ہیں جبکہ کچھ کو یہ گنوارہ نہیں۔

انتخابات کا جوش دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ جب یہ آرٹیکل چھپے گا تو بیلٹ باکس بھر چکے ہوں گے اور لوگ نتائج کے انتظار میں ہوں گے۔ جہاں یہ سوال ہے کہ کیا ہمارے رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کے منشور ملک کے اور عوام کی امنگوں کے گرد گھومتے ہیں؟ تو وہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کیا آنی والی حکومت اس متعلق کچھ سوچے گی؟ یہ سروے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ عوام کے تصورات اور خیالات تبدیل ہو رہے ہیں، آخر کار پاکستان اس دور میں داخل ہو رہا ہے جہاں عوام جو چاہے وہی ہو اور ملک سے کرپشن، ناقص حکومتی نظام اور غربت کا خاتمہ ہو سکے۔ جب ایک ملک کے شہری تبدیلی کا مطالبہ کرنے لگیں اور اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے لگیں تو اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ارتقاء کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اب وقت آ چکا ہے کہ جو بھی اقتدار سنبھالے اسے وہی کرنا ہوگا جو عوام چاہے گی۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

ایوان اقتدار اور سیاست: ایک تبصرہ

حمزہ خان

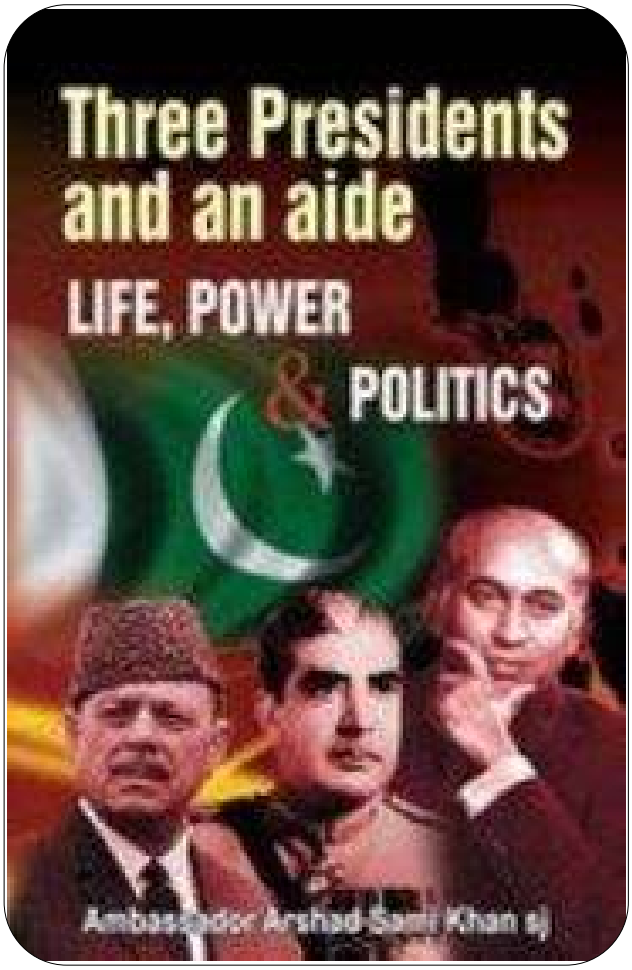

سفارتکار سمیع خان نے پاکستان کے تین صدور کے معاون کے طور پر خدمات انجام دیں ہیں، جن کا پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اہم کردار رہا ہے۔ ان میں فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو شامل ہیں۔ وہ Aide-de-camp اے ڈی سی کے طور پہ کام کرتے رہے ہیں۔ اے ڈی سی کو سینئر افسر کی مدد کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب Three Presidents and an Aide: Life, Power and Politics ایک ایسے اے ڈی سی کی کہانی ہے جس نے پاکستان میں سب سے بڑے عہدے پر فائز شخصیات کی مدد کی ہے۔ یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ایک اے ڈی سی کو اپنے افسر بالا کے بارے میں مکمل معلومات ہوں۔ اس کی عادات اور طبی حالت کے بارے میں جانتا ہو، اس کی معاشرتی ضروریات کو سمجھتا ہو، اس کی پسندیدہ خوراک کے بارے میں علم رکھتا ہو اور سب سے اہم یہ کہ انہیں اپنے افسر اور اس کے خاندان کا اتنا اعتماد حاصل ہو کہ وہ اے ڈی سی کو اپنا اور خاندان کا دوست سمجھیں۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۲ء کے درمیان صدارتی محل میں جو واقعات پیش آئے، سمیع خان انہیں نہایت اہم گردانتے ہیں۔ پاکستانیوں نے اس دوران دو جنگیں دیکھیں اور ملک کے مشرقی حصے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ کتاب شاید علمی اور دانشورانہ اعتبار سے بہت اونچے مقام پر نہ ہو اس بات کا اعتراف مصنف نے بھی خود اس کتاب میں کیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کی اس دور کی یاداشتوں کا مجموعہ ہے۔ مگر پھر بھی مصنف نے نہایت دلچسپ طریقے سے اس دور کے واقعات بیان کیے ہیں۔

۲۰۰۸ء میں پہلی بار شائع ہونے والی یہ کتاب پڑھنے والے کو واپس ان دنوں میں لے جاتی ہے جب پاکستان نے ایک خودمختار ریاست کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ ملک کے پہلے فیلڈ مارشل ایوب خان نے ملک سے خطاب کے دوران عوام کو بتایا کے اب وہ اقتدار میں رہنے کے خواہش مند نہیں ہیں اور آئینی ذمہ داریاں جنرل یحییٰ خان کو سونپ کر جا رہے ہیں۔ فیلڈ مارشل کو دوسرے جنرل کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے چھے منٹ لگے۔ ایوب خان کے خطاب کے بعد جنرل یحییٰ نے ٹی وی پر آ کر علان کیا کے اب وہ چیف مارشل لاء ایڈمینسٹریٹر ہیں۔ جیسے ہی دونوں آمروں کی تقریریں ختم ہوئیں مصنف کے دفتر میں سب ٹیلیفون بجنے لگے۔ فون کرنے والوں میں دوست، رشتہ دار اور سابقہ کابینہ کے ممبران تھے جو معزول صدر سے بات کرنے کے خواہش مند تھے اور اس مشکل وقت میں ان کا ساتھ دینے کی یقین دہانی کروانا چاہتے تھے۔

یہ کتاب صدارتی محل میں پیش آنے والے واقعات تک محدود ہے۔ سمیع خان نے بڑی کامیابی کے ساتھ دوبارہ منظرنامے کی تخلیق کی ہے جس کی وجہ سے

پڑھنے والے کو سیاسی تبدیلیوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ کتاب پڑھنے والے کو یہ یاد دلاتی ہے کے ملک کے لیڈران کو آغاز سے ہی کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کے ملک کو پہلے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اب وہ جن مسائل سے دوچار ہے وہ تقریباً ایک جیسے ہی ہیں۔ ایک شخص جس کو سیاسی تاریخ پر اچھی گرفت ہے وہ یہ کہہ سکتا ہے کے آغاز ہی سے مسائل ایک جیسے تھے صرف وقت اور شکلیں تبدیل ہوتی رہیں ہیں۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے حکمران ہمیشہ اقتدار کے بھوکے رہے ہیں۔ انھوں نے ملک کو چلانے کے معاملات پر توجہ دینے کے بجائے ہمیشہ سیاسی ہیرا پھیریوں پر توجہ دی ہے۔ یہ ہماری ملکی سیاست کا اہم حصہ رہا ہے کہ جب ایک نیا حکمران اقتدار سنبھالتا ہے تو وہ پچھلے حکمران کی پالیسیوں اور تجاویز کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مصنف اس کو ایک واقعے میں بیان کرتا ہے کہ جب جنرل یحیٰی خان نے ملک سنبھالا تو انھوں نے بھی سابقہ صدر کی تجاویز کو نظر انداز کر دیا۔ ایوانِ صدر چھوڑنے سے پہلے ایوب خان نے یحیٰی خان کے پڑھنے کے لیے ایک اہم نوٹ چھوڑا، جب مصنف نے یحیٰی کے چیف آف اسٹاف جنرل پیرزادہ کی ڈائریکٹ لائن پر رابطہ کیا تو جنرل پیرزادہ نے ان سے کہا کے ہمیں وہ نوٹ مل گیا ہے۔ اگر ہم ان کے تصورات کے مطابق چلے اور ان کی تجاویز پر عمل کیا تو ہم بھی ان کی طرح برباد ہو جائیں گے۔ یہ پالیسی صرف ایوب خان اور یحیٰی خان تک محدود نہیں رہی بلکہ جب دوسرے رہنماؤں نے اقتدار سنبھالا تو انھوں نے بھی وہی تاریخ دہرائی اور سابقہ حکمرانوں کی پالیسیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اس کتاب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کے جب ایک حکمران کو برطرف کیا جاتا ہے تو جو لوگ اس کے اقتدار میں لاتے ہیں وہی لوگ ایک دم اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔

مصنف نے ڈھکے چھپے الفاظ میں مگر صاف گوئی سے اس دور کے دلچسپ واقعات بیان کئے ہیں ۔ یہ کتاب ہمیں اپنے ملک کے حکمرانوں کی ذاتی زندگیوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتی ہے۔ میرے لیے ایک دلچسپ قصہ وہ تھا جہاں مصنف ایوب خان کے بیڈروم میں لگی ہوئی جیکی کینیڈی کی اس تصویر کا ذکر کرتا ہے جس میں جیکی کینیڈی گھوڑے پر بیٹھی ہیں اور اس پر لکھی ہوئی جیکی کینیڈی کی پیار بھری تحریر ایوب خان اور جیکی کینیڈی کے خاص رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔

اسی طرح یحیٰی خان اور ذوالفقار علی بھٹو کی کہانیاں بھی بیان کی گئی ہیں جو پڑھنے والے کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہیں ۔ یحیٰی خان کے بارے میں میرا پسندیدہ واقعہ وہ ہے جب یحیٰی خان نے ایک پارٹی میں مصنف سے نور جہاں کا نیا پنجابی گانا سننے کا اثرار کیا، یہ رات ۱۲ بجے کا وقت تھا۔ مصنف نے تو کسی طرح ان گانوں کے ریکارڈ کا انتظام کر دیا لیکن بعد میں اس کہانی نے کچھ اور ہی رخ اپنا لیا اور یہ بات پھیل گئی کے یحیٰی خان کے کہنے پر نور جہاں کو لاہور سے کراچی بلایا گیا تھا جو کہ ایک افواہ تھی۔

مصنف اس کتاب کے آخری صفحات پر بینظیر بھٹو کے دور کے ایک بین الاقوامی واقعے کو کچھ یوں بیان کرتا ہے کہ اپنے دورِ حکومت کے دوران بینظیر بھٹو نے کبھی بھی مرد حضرات سے ہاتھ نہیں ملایا تھا، یہ بات ان کے لیے نہایت اہم تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ اپنے پروٹوکول افسر کو یہ یاد کرواتی تھیں تا کہ وہ دوسرے رہنماؤں کو اس بات سے پہلے ہی آگاہ کر دیں۔ جب یاسر عرفات نے پاکستان کا دورہ کیا تو بینظیر نے مصنف کو خصوصی طور پر بار بار آگاہ کیا کہ وہ یاسر عرفات سے ہاتھ نہیں ملائیں گی۔ آخری وقت جب عرافات جہاز کی سیڑھیوں سے اترنے والے تھے تو انھوں نے عزت مآب کو بتایا کے وزیراعظم بینظیر بھٹو آپ کے استقبال کے لیے نیچے کھڑی ہیں اور آپ کو میں بتا تا چلوں کے وہ مردوں سے ہاتھ نہیں ملاتیں، جس کے جواب میں یاسر عرافات نے کہا ہاں مجھے پتا ہے مجھے بتایا گیا ہے، پھر بھی یاد کرانے کا شکریہ۔ لیکن جب عرافات ہوائی جہاز سے اترے اور بینظیر سے ملے تو انھوں نے اپنا ہاتھ آگے کیا جس پر وزیراعظم بے نظیر بھٹو بہت حیران ہوئیں اور شرماتے ہوئے ہاتھ ملایا اور گارڈ آف آنر کی طرف چلتے ہوئے مصنف کو کان میں کہا تم نے ان کو بتایا نہیں کہ میں ہاتھ نہیں ملاتی، جس پر مصنف جواب دینے ہی لگا تھا کے یاسر عرافات نے کہا میڈم آپ خوش قسمت ہیں کہ میں نے عربی روایات کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ کو بوسہ نہیں دیا۔

یہ کتاب مشہور سیاسی شخصیات کے بارے میں دلچسپ معلومات کے ساتھ ساتھ ان مسائل کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو ان شخصیات کے ادوار میں پاکستان کو درپیش تھے۔اس کتاب کو پڑھنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کے مسائل تاریخ میں ایک جیسے ہی رہے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مسائل کی شدت مختلف ہوتی رہی ہے۔ ہمارے ملک میں ہمیشہ سے اداروں کو پختہ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے حکمرانوں کے احتساب کے لیے کوئی سسٹم رائج نہ ہو سکا۔مثال کے طور پر ان تین صدور کے ادوار میں جن کا ذکر مصنف نے اس کتاب میں کیا ہے، اس نے رشوت ستانی اور اقربا پروری کی کئی مثالیں بیان کی ہیں۔ان شخصیات کے علاوہ اور بھی رہنما جو اقتدار میں آئے ان کی بھی حکومتیں رشوت ستانی اور اقربا پروری سے بھری پڑی تھیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کے اقربا پروری اور رشوت ستانی نے نہ صرف حکومت کی کارکردگی کو اثر انداز کیا ہے بلکہ ملک کے مختلف اداروں کو بھی کمزور کیا ہے۔ جب سے پاکستان ایک خودمختار ریاست بنا ہے اس وقت سے ہی اس کو ایک ہی نوعیت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔کتاب کا تفصیلی مطالعہ اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کے آغاز ہی سے کچھ افراد نے ملک کے مختلف اداروں کی پاسداری نہیں کی اور ان افراد نے ہی اقتدار میں رہ کر ملک کے کسی بھی ادارے کی اہمیت کا احترام نہیں کیا۔مختلف موقعوں پر چیف آف آرمی اسٹاف کے انتخاب کے قانونی طریقے کو نظر انداز کیا گیا اور جن افراد کی کوئی سیاسی بصیرت نہیں تھی ان کو آرمی چیف کے عہدے پر مقرر کر دیا گیا۔اس ہیرا پھیری نے نہ صرف ان لوگوں کو محروم کیا جو اس قابل تھے اور اس عہدے کے حق دار تھے بلکہ اور بھی خرابیوں کو جنم دیا، اور اسطرح فوج کے چند سربراہان سالوں تک آئین کی دھجیاں بکھیرتے رہے۔

مصنف نے ان مختلف واقعات کو بھی اجاگر کیا ہے جس میں افراد اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے ان معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں جو ان کے دائرہِ کار میں نہیں تھے۔ جب جنرل یحییٰ نے جنرل نیازی اور گورنر ملک کو یہ اختیار دیا کہ وہ مشرقی پاکستان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے بہتر اقدام اٹھائیں تو گورنر ملک نے سفارتی طریقہ کار کو نظر انداز کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو خط لکھ دیا۔جنرل یحییٰ کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے جنرل حمید کو لکھا بھیجا کہ اس کو بتاؤ کے میرا اس کو یہ اختیار دینے کا مقصد یہ تھا کہ ان حالات میں جو کچھ بہتر ہو سکے وہ کرو، نہ کہ وہ سفارتی طریقوں میں مداخلت کرے۔اس طرح کے واقعات ملک کے ابتدائی سالوں تک محدود نہیں رہے بلکہ یہ بعد کے سالوں میں بھی بار بار دہرائے گئے اور یہ حکومتِ پاکستان کے خصوصی کارنامے بن کر رہ گئے۔

پاکستان کو وجود میں آئے ۶۶ برس ہوئے ہیں لیکن جو مسائل اور رکاوٹیں پہلے درپیش تھیں اب بھی وہی ہیں۔سیاست حکومتی اداروں کے بجائے بڑی شخصیات اور افراد کے اردگرد ہی گھومتی رہی ہیں جس کے نتیجے میں عوام صحیح طور پر اداروں کی اہمیت کو کبھی بھی نہیں سمجھ پائے۔ جب بھی کوئی فرد اقتدار میں آتا ہے وہ اپنی سیاسی وفاداریاں پرانی سے نئی میں تبدیل کر لیتا ہے۔ملک کی سیاست میں ایوب خان سے لے کر نواز شریف تک یہی طریقہ کار رہا۔ ہماری سیاست ہمیشہ سے فوجی مداخلت، سازشوں اور سیاسی ہیرا پھیریوں کا شکار رہی ہے جس کی وجہ سے ہمارا ملک بری طرح ناکام رہا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جو رہنما اقتدار میں آئے ان میں ملک چلانے کی سیاسی بصیرت اور عقل موجود تھی۔ ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو اور بینظیر بھٹو نے دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی مگر جو توقع تھی وہ اس میں وہ ناکام رہے۔کیا ہمیں اس بات کا کبھی احساس ہوا ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہم ایک ملک کی حیثیت سے کیوں ناکام رہے ہیں؟ تاریخ کی اچھی بات یہ ہے کہ اس سے سیکھا جا سکتا ہے۔اب وقت آ گیا ہے کے ہم ماضی کو پیچھے چھوڑ دیں اور ایک نیا پاکستان بنانے کی کوشش کریں جو رشوت ستانی، اقربا پروری اور گندی سیاست سے پاک ہو، اور رہنما اور شہری کی حیثیت سے ہم وہ کچھ کر سکیں جس کی ضرورت ہے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

سب سے بڑا روپیہ

یحییٰ احمد

کیا یہ ممکن ہے کہ پاکستان کا عام شہری یا درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک شخص پارلیمانی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر سکے؟ تو اس سلسلے میں اہم اقدامات کیا ہوں گے؟ سب سے پہلے وہ کسی سیاسی پارٹی سے رابطہ کرے گا یا پارٹی کا رکن بننے کی کوشش کرے گا یا آزادانہ طور پہ لڑنے کا فیصلہ کرے گا یا پھر اپنی تعلیمی ڈگری چیک کروائے گا وغیرہ وغیرہ انتخابات کے معیار پر اترنے کے بعد سب سے اہم عناصر کیا ہے جن کے بارے میں وہ فکرمند ہوگا؟ کوئی اندازہ؟ میرے خیال میں تو یہ کہ کیا اس کے پاس اتنا اثاثہ ہے کہ وہ اپنے انتخابی حلقے میں ایک کامیاب انتخابی مہم شروع کر سکے۔

اگرچہ جمہوریت کا مطلب عوام کی طاقت ہے لیکن پاکستان جیسے ملک میں شاید ہی ایسا ممکن ہو۔ پاکستان میں انتخابی عمل کی ایک خاصیت یہ رہی ہے کہ ہمیشہ اثر ورسوخ اور اثاثوں والے لوگ ہی اقتدار میں آتے ہیں۔ معاشرے میں سیاسی عمل کی فعالیت پارٹی فنڈز پر منحصر ہے۔ ملک میں جاری جمہوری عمل پر عوام کی بے اعتمادی میں اضافے کی کئی وجوہات ہیں، جن میں سے سب سے اہم سیاسی جماعتوں کے اپنی انتخابی مہمات پر اخراجات ہیں۔ سیاسی مہمات پر بے جا اخراجات نا صرف انتخابات پر تسلط قائم کرتے ہیں بلکہ ووٹروں کی تعداد میں کمی کا باعث بھی بنتے ہیں۔ الیکشن کمشن آف پاکستان کی جانب سے انتخابی مہم پر خرچ کرنے کی حد پندرہ (۱۵) لاکھ مقرر کی گئی ہے۔ آجکل اتنا خرچہ تو عام سی شادی پر بھی ہو جاتا ہے تو آخر ایک انتخابی مہم کس طرح پندرہ لاکھ میں محدود رہ سکتی ہے؟

مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتیں کس طرح ایک بھاری رقم تک رسائی حاصل کرتی ہیں؟ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مختلف سیاسی جماعتیں اپنے سیاسی رہنماؤں کے ذاتی اکاؤنٹس یا عطیات کے خفیہ نظام پر انحصار کرتی ہیں۔ بعض سیاسی جماعتیں اپنی مہم کو چلانے کے لیے بھتہ وصول کرتی ہیں۔ تحقیق کے مطابق حکمران جماعتیں قومی ترقیاتی فنڈز، خفیہ فنڈز اور کبھی مذہبی ٹیکسز جیسا کہ زکوٰۃ اور بیت المال کی مد میں پیسے وصول کرنے پر ہچکچاتی نہیں ہیں۔ اگر سیاسی جماعتوں کو چلانے کے یہ ذرائع ہیں تو کیا ہم رشوت ستانی سے پاک معاشرے کی امید کر سکتے ہیں؟

پاکستان کا الیکشن کمیشن آئین کے آرٹیکل ۶۲ اور ۶۳ کے تحت مختلف سیاستدانوں کی جانچ پڑتال کر رہا ہے اور اسلام کی بنیادی سمجھ بوجھ نا ہونے پر ان کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کر رہا ہے۔ مگر ای سی پی سیاسی جماعتوں کی فنڈنگ کے ذرائع کی جانچ پڑتال نہیں کر رہا۔ جمہوریت کے عمل سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے جس سے سیاسی جماعتوں کی فنڈنگ کے طریقے کار پر نظر رکھی جا سکے۔ اگر یہی نظام چلتا رہا تو تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی رہے گی اور سیاستدان اپنی جیبیں بھرنے کے لیے عوام کے پیسے کا استعمال کرتے رہیں گے۔

ایک ایسے طریقہ کار کو متعارف کروانے کی ضرورت ہے جس سے سیاسی

جماعتوں کے اس عمل کو کنٹرول میں رکھا جا سکے۔ ایک نیا نظام جسے دنیا میں "عوامی فنڈنگ" کے نام سے جانا جاتا ہے پچھلے کچھ عرصے میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو سیاسی جماعتوں کو عوام کے فنڈز انتخابی مہمات پر خرچ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سیاسی پارٹیوں کو انتخابی سرگرمیوں میں پیسہ عوامی وسائل سے ملتا ہے۔ یہ نسبتاً ایک نیا نظام ہے جو سیاسی جماعتوں کی پارلیمان میں متناسب طاقت کے اصولوں پر چلتا ہے۔

یہ نظام پاکستان جیسے ملک میں بھی متعارف کروایا جا سکتا ہے جس سے اس عمل کو یقینی بنایا جا سکے گا کہ انتخابی مہم کے دوران اخراجات پر توازن قائم رکھا جائے گا۔ یہ نظام مزید کرپشن کے لیے بھی راہ ہموار کرتا ہے یا اگر ہم کچھ پیشگی شرائط مان لیں تو یہ طریقہ کار پاکستان میں بہت فائدہ مند بھی ثابت ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ جماعتیں جو عوامی معیار پر پورا اتریں وہ ہی عوامی فنڈنگ کی اہل ہوں اور یہ عوامی فنڈنگ صرف جماعتی انتخابات کے لیے استعمال کیا جائے۔ جو جماعتیں باقاعدگی سے جماعت کے اندر انتخابات کرواتی ہیں صرف وہ ہی درخواست دے سکتی ہیں۔ مزید یہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت میں خواتین کا مخصوص کوٹہ ہو، سیاسی جماعتیں ایک معاہدے پر دستخط کریں جس میں مجرمانہ سرگرمیوں کی مذمت کی جائے اور ان میں شامل ہونے کی صورت میں ان پر کاروائی کی جائے۔

اس طریقہ کار کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ سیاسی جماعتوں کی فنڈنگ کے لیے وسائل کا استعمال کیسے ہو؟ ایک حل یہ بھی ہے کہ ہر ووٹ کے لیے مخصوص پیسے رکھ دیے جائیں۔ مثلاً ہر ووٹ دینے پر دس روپے۔ ای سی پی کی ویب سائٹ ۲۰۱۱ء کے مطابق پاکستان میں رجسٹرڈ ووٹرز کی تعداد ۸۰۷۲۴۰۰۹ ہے اور اگر اتنے لوگ ووٹ ڈالنے آئیں تو سیاسی جماتوں کو پبلک فنڈنگ کے تحت ۸۰ ملین روپے وصول ہونگے۔ سیاسی جماعتوں کی فنڈنگ پر نظر رکھنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہونی چاہیے؟ ایک خودمختار ادارے کا کا قیام عمل میں آنا چاہیے جس میں حکومت، سیاسی جماعتوں، سول سوسائٹی اور ای سی پی کی بھی نمائندگی ہو اور یہ ادارہ قابلِ عمل پالیسیاں بنا کر پورے طریقہ کار پر نظر رکھ سکتا ہو۔

اس طریقہ کار میں خامیاں بھی موجود ہوں گی اور یہ عوام کے پیسے کے استحصال کے لیے مزید گنجائش بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس مسئلہ کا حل فنڈز اور عطیات کے سلسلے میں سخت اقدامات نافذ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ ڈونرز اور امیدوار جو غبن کے ملزم ہوں ان کو سخت سزا ملنی چاہیے اور انہیں انتخابات میں حصہ لینے سے روک دینا چاہیے۔ تاہم اس نظام کے تحت سیاسی جماتیں سیاسی میدان میں مقابلہ کرنے کے لیے سرگرم ہوں گی، جس کی وجہ سے وہ شہریوں کے ساتھ بہتر طور پر رابطہ رکھ سکیں گی۔ ایک دفعہ جماعتوں کو مہم کی فنڈنگ کی فکر ختم ہو گی تو وہ اپنے پیغامات پر غور کریں گے جو انہیں مستقبل کے رہنماؤں کو تیار کرنے میں مدد دے گا۔ جب وہ فنڈز کے بارے میں فکر چھوڑ دیں گے تو تمام شعبہِ زندگی سے لوگوں کو آگے آنے کے مواقع میسر آئیں گے۔ یہ پورا نظام ملک میں پارٹی سسٹم کو مظبوط کرنے میں فروغ دے گا اور توجہ امیر افراد سے ہٹ کر پارٹی پالیسیوں اور ان کے مثبت اقدامات کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ ایسے اقدامات اٹھائے جائیں تو وہ سیاست میں فنڈز کے بے دریغ استعمال پر پابندی کا باعث بن سکتے ہیں۔

ایسے قانون کا نفاذ ہو سکتا ہے جس کے تحت جو عطیات سیاسی جماعتوں کے پاس جا رہے ہیں ان کے ڈونر کا سراغ لگایا جا سکے۔ سب عطیات کا ریکارڈ پبلک ریکارڈ میں موجود ہو اور ڈونر کا براہ راست سراغ لگایا جا سکے جس سے معلوم ہو کہ کتنی رقم دی گئی اور کب دی گئی۔ مزید یہ کہ ان جماعتوں پر سخت نظر رکھی جائے جو عوام کے وسائل سے اپنی مہمات چلاتے ہیں۔ جیسا کہ حکومت میں جو جماعتیں ہیں ان کو اپنی سیاسی مہمات کے لیے حکومتی وسائل کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ حکومت کو ڈونرز بھی محدود کر دینے چاہییں، جیسے کہ بڑی کمپنیوں کے سیاسی جماعتوں کو عطیات فراہم کرنے پر پابندیاں لگا دینی چاہیے اور اگر وہ پھر بھی ایسا کرتی ہیں تو انکی عطیات کو ایک حد تک محدود کر دینا چاہیے۔ آخر میں یہ کہ ایک طاقتور اور خودمختار ادارے کا قیام عمل میں آئے جو ملک کی سیاسی جماعتوں کے مالیات پر نظر رکھے اور ان کے فنڈز کو عوام کے سامنے پیش کرے تا کہ عوام کے پاس ان کے چھوٹے چھوٹے اخراجات کا ریکارڈ موجود ہو۔

مناسب رہنماوں کے انتخاب کے عمل کو یقینی بنانے کے لیے اور یہ دیکھنے کے

لیے کے ہمیں صحیح معنوں میں فائدہ ہوا ہے، ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے سیاسی طریقہ کار میں ایسی اصلاحات اور پالیسیوں کی وکالت کریں۔ ایک طویل اور لمبے عرصے کے بعد ہم یہ جان سکے ہیں کہ جمہوریت ملک کو چلانے کے لیے سب سے بہترین طریقہ ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے جمہوری رہنماؤں کو مزید کھلی چھٹی نہیں دینی چاہیے اور ایک شفاف فنڈنگ نظام کے نفاذ کے ذریعے پرعزم لوگوں کو ملک کے مستقبل کے رہنما بنانے کی کوشش کریں۔

یہ مضمون اس ریسرچ پیپر میں پیش کیے گئے خیالات کی عکاسی کرتا ہے جو کہ اس ویب سائٹ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

http://www.civiceducation.org/wp-content/uploads/2010/08/Clean-M oney-for-Clean-Politics.pdf

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

Individualland
Creating space for the individual
Are You a Leader?
Online Leadership Course
Looking for a leader to lead! Stand in front of a mirror and you'll find one. Leader is not born, s/he is made when s/he combines the experiences and knowledge which comes her/his way. Experience is what you will have with time but knowledge is something which we are willing to provide. We aim to provide an online course which will focus on enhancing the leader with in you.
Course Module:
• Module 1 - The Leader in me
• Module 2 - Understanding my environment
• Module 3 - I am "FIRM"(Free, Independent & Responsible Media)
• Module 4 - Personal goals
Applicant's Criteria:
• Personal statement (500 words)
• Bachelor's degree
• Age limit 19 to 35
• Proficiency in English
• Computer literate
• Educational qualifications and/or profession
• CNIC or Form B showing your age.
Online Phase Duration:
The online phase would be for 14 days
i.e. June 17th - July 4th 2013.
Email: coordinator@individualland.com
www.individualland.com
Find us on facebook:
Individualland

اپنی توجہ مرکوز کریں Young Ambassadors for Peace (YAP) کا زبردست پروگرام عنقریب آنے لگا ہے آپ کی ٹی وی اسکرین پر۔

۲۴ ضلعی، ۴ صوبائی، ایک تربیتی پروگرام اور ایک گرینڈ فنالے کی مدد سے امن کا پیغام پھیلا دیا گیا ہے۔

انڈیویجوئل لینڈ پاکستان نے پچھلے سال اگست میں "امن کے نوجوان سفیر" کے حوالے سے تقریری مقابلوں کا انعقاد کیا۔ اس پروگرام کا مقصد نوجوانوں کو درپیش مسائل کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ایک ایسا موقع فراہم کرنا تھا جس سے وہ اپنی آواز بلند کر سکیں۔ ان تقریری مقابلوں میں کچھ ایسا ہی ہوا۔ نوجوانوں نے اپنے آبائی علاقوں سے اپنی آواز بلند کرنا شروع کی، الفاظ ادا ہوئے، بحث و مباحثہ ہوا، اور اس سے پہلے کہ ہمیں اس بات کا ادراک ہوتا، امن کے اس سفر میں نوجوانوں کے لئے شروع کیا گیا یہ تقریری پروگرام ایک ریئیلٹی شو کی صورت اختیار کر گیا۔

۲۴ اضلاع سے تعلق رکھنے والے ۲۴۷ امیدواروں میں سے صرف ۲۰ فائنل میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو پائے، اور یہی ۲۰ نوجوان 'امن کے نوجوان سفیر' کہلائے۔ یہ تمام مقابلے، تقریریں، جذبات اور شروع سے آخر تک کا یہ سفر کیمرے کی آنکھ نے ریکارڈ کیا۔

۱۹ مئی ۲۰۱۳ء سے یہ پورا سفر ۱۳ قسطوں پر مبنی ایک ریئیلٹی شو کی صورت میں آپ کی ٹی وی اسکرین پر پیش کیا جائے گا۔ انتظار کی گھڑیاں اور خواب دیکھنے کے دن اب ختم۔

اور Young Ambassadors for Peace (YAP) کا بھی یہی پیغام ہے "زنجیریں توڑ، مچا شور"۔

ادارے سے آگاہی

انڈو یجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

انڈو یجوئل لینڈ نے واضح طور پر قانون دانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے اور خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔

اشاعت

میڈیا سے متعلق

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

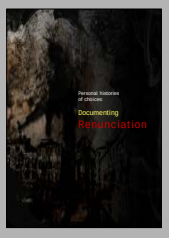

پاکستان پولیس خواتین

فرد میگزین

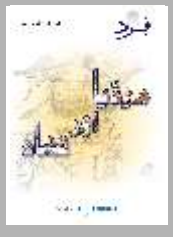

حکومت اور احتساب

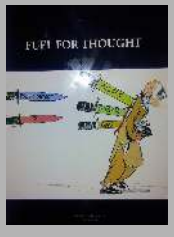

اقتصادیات

اگلی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۳ میں

http://individualland.com/firm-blog/
info@individualland.com
www.individualland.com